جلد ۷۱ — جون ۱۹۶۹ء — عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرِ سالانہ : سات روپے
فی پرچہ : ۵۰ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۱	جون ۱۹۶۹ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۸۹ھ	عدد ۴

چندہ سالانہ — ماہنامہ ترجمان القرآن — قیمت فی پرچہ

[ت]ت روپے — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — ۷۵ پیسے

[ا]بو مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

جماعت اسلامی کی "سیاسی سرگرمیاں" اس کے مخالفین کے لیے تو خیر تکلیف کی باعث ہیں ہی مگر ان پر بعض اوقات وہ حضرات بھی تشویش کا اظہار کرنے لگتے ہیں جن کا عام طرزِ عمل جماعت اور اس کے محترم امیر کے ساتھ بڑا ہمدردانہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب "جماعت" سیاسی سرگرمیوں میں ذرا زیادہ اُبھر گئی، تو بہت سے "بہی خواہوں" کی زبان اور قلم سے اس قسم کے جُملے نکلے کہ "جماعت اسلامی ایک دینی جماعت ہے سیاست میں دخیل ہو کر اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو گندگی میں ملوث کر لیا ہے"۔ "مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے اچھی دینی بصیرت عطا کی ہے وہ قلم کے زور سے دین کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں، یہ دین سیاست میں پڑ کر بلاوجہ اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں"۔ اس قسم کے جملے الفاظ کے تھوڑے سے ردّوبدل کے ساتھ بارہا سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں خصوصاً جب سیاسی زندگی میں ہلچل پیدا ہوتی ہے اور جماعت کو اس میدان میں ذرا زیادہ سرگرمی دکھانی پڑتی ہے تو جماعت کے بعض خیرخواہ ان تاثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور بسا اوقات خود رفقاء جماعت سے مل کر انہیں اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ جماعت اور اس کے امیر کو اس گندگی سے بچانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔

ان حضرات کے خلوص اور جذبۂ صادق کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں مگر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ۲۰ سال سے جو جماعت تحریر، تقریر اور اپنے عملی کام کے ذریعہ سے مسلسل اپنے موقف کو واضح کر رہی ہے اس کے اصل مقصد اور اس کے کام کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ان کو آخر اتنی زحمت کیوں پیش آ رہی ہے۔ ان حضرات کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ جماعت اسلامی صرف سیاسی کام ہی نہیں کر رہی ہے بلکہ

یہ اس کے دائرہ کار کا صرف ایک حصہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسندِ اقتدار کا حصول ہماری جدوجہد کا مقصود کبھی نہیں رہا ہے۔ اگر یہ ہمارا مقصود ہوتا تو ہمارے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہوتے۔ ہم نے بارہا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اس ملک کا جو صاحبِ اقتدار بھی خلوصِ نیت کے ساتھ یہاں واقعی اسلامی نظام کے قیام کے لیے کام کرے ہم اس کی رکاب تھام کر چلنے کو اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کریں گے۔ پھر ہمیں کوئی دماغی مرض بھی لاحق نہیں ہے کہ ہم خود اپنے دشمن بن گئے ہوں اور طرح طرح کے مخالفین سے خواہ مخواہ گالیاں کھانے اور اقتدار کے ہاتھوں بلاوجہ ظلم و ستم سہنے میں ہمیں کوئی لذت محسوس ہوتی ہو۔ جب ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر ہمارے کرم فرماؤں کو اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا خاص ضرورت ہے جس کی خاطر قیامِ پاکستان کے بعد سے ہم مسلسل اس ملک کے سیاسی خارزار میں گام زن ہو کر اپنے لیے ہر طرح کی پریشانیاں مول لے رہے ہیں؟ اگرچہ ہماری طرف سے اس کی وضاحت میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی ہے، لیکن ایک مرتبہ پھر ہم اس سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ اس سے ہماری دعوت کی نوعیت ہماری تحریک کا مقصد، منہاج اور ہماری سیاسی، معاشرتی، مذہبی سرگرمیوں کی صحیح صورت انشاء اللہ سامنے آجائے گی اور جو لوگ ہمارے کام کو خلوصِ نیت کے ساتھ سمجھنے کے خواہشمند ہیں ان کی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

جس دعوت کو جماعت اسلامی بفضلِ ایزدی لے کر اٹھی ہے وہ صرف اسلام کی دعوت ہے اور جس نوعیت کے کام وہ کر رہی ہے وہ فی الحقیقت دینِ حق کے تقاضے ہیں۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ اسلام زندگی کے بارے میں کیا تصور پیش کرتا ہے۔ جو لوگ مختلف مذاہب پر نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عام طور پر مذہب کا مقصد یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی روح کو لامحدود ذات سے ہمکنار ہونا نصیب ہو جائے اور اس طرح ایک قطرہ بحرِ بیکراں میں گم ہو کر اس کی غیر معمولی قوت اور وسعت سے لطف اندوز ہو سکے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب روح جسم کی کثافتوں سے آزاد ہو جائے۔ اس نظریۂ زندگی کے مطابق روح جسم کی دشمن ہے، اور جسم روح کا دشمن

اور دونوں ایک دوسرے کو زک پہنچانے کو ہی اپنی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ کثیف جسم لطیف روح کی پرواز میں حائل ہوتا ہے اور اس بات کی برابر کوشش کرتا ہے کہ اس کی کثافتیں روح کو بھی کثیف بنا کر اس سے قوت پرواز سلب کر لیں۔ اسی طرح روح بھی برابر اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ جسم کے بندھن مضبوط ہونے کے بجائے تار تار ہوں اور روح جلد از جلد ان سے رہائی حاصل کرے۔ چنانچہ روح جسم کو قوت و توانائی بہم پہنچانے کے بجائے اسے کمزور اور مضمحل کرنے کی فکر کرتی ہے اور جسم اپنی کثافتوں سے روح کو بوجھل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

جسم اور روح کے درمیان اس حریفانہ تعلق نے زندگی کے پورے ڈھانچہ کو متاثر کیا ہے۔ اس تصور کے تحت صحیح معنوں میں مذہبی اور روحانی آدمی وہ ہوتا ہے جو دنیوی علائق سے یکسر بے تعلق ہو کر اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گیان دھیان، مراقبہ و مکاشفہ اور مجاہدہ و ریاضت میں صرف کرے اور دنیا اور اس کے معاملات سے کسی طور پر بھی تعرض نہ کرے۔ جس نسبت سے کوئی انسان دنیوی معاملات اور تعلقات سے دامن بچا کر نفس کشی میں مشغول رہے اسی تناسب سے اسے روحانیت کی دولت سے مالا مال سمجھا جاتا ہے اور جس قدر اس کے اندر امور دنیا سے دلچسپی ہو اسی نسبت سے اسے روحانیت کی نعمت سے محروم تصور کیا جاتا ہے۔

اس بنیاد پر زندگی کی ثنویت کا تصور قائم ہوا۔ روحانی زندگی کے شیدائیوں نے مادی زندگی سے یکسر منہ موڑ کر اپنی توجہ روحانی کیف و مستی کے حصول میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ وہ جہاں بھی رہے اپنے ملک کے معاشرتی ڈھانچے، اس کی سیاسی ہیئت، اس کی معاشی تنظیم اور اس کے اجتماعی مسائل سے بے تعلق رہے، حتیٰ کہ خود اپنے جسم کے تقاضوں سے بھی انہیں نفرت ہی رہی۔ ان کے ذہن میں یہ بات پوری طرح راسخ ہو گئی کہ زندگی کے یہ سارے دائرے نجس اور ناپاک ہیں اور وہ ان سے جس قدر دور رہیں گے اسی قدر وہ روح کی پاکیزگی کے لیے زیادہ سامان فراہم کر سکیں گے۔ اس بنا پر مذہبی لوگوں نے اپنے دامن کو دنیوی معاملات سے ہمیشہ بچانے

کی نگرانی میں دنیا کا سارا کاروبار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہب اور اس کی اخلاقی قدروں یا روحانیت کے لطیف احساسات سے نہ صرف یکسر محروم تھے بلکہ انہیں خود اپنے بارے میں روحانی و اخلاقی احساس سے تہی دست ہونے کا پورا پورا طرح اعتراف تھا۔ ان کے ضمیر میں یہ بات اچھی طرح رچی بسی تھی کہ وہ شیطان ہیں اور دنیا کے معاملات چلانے کا جو کام وہ کر رہے ہیں وہ شیطانی کام ہے اور شیطانی طریقوں ہی سے چلایا جانا چاہیے۔ قیام عدل اور انصاف کے حق کے لحاظ سے جب نیک اور خدا ترس لوگ دستبردار ہو جائیں تو چور اُچکے اس مسند کو خالی پاکر مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ اس پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں میزان عدل کا جیسا کچھ حشر ہو سکتا ہے وہی انسان کی اجتماعی زندگی کا ہوا ہے۔ مذہب کے اسی تصور کے تحت خدا کے نیک اور پاکباز بندوں نے جنگلوں اور ویرانوں کا رخ کیا اور وہاں مراقبہ کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اجتماعی زندگی کی عنان خود بخود ان لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دی جو نیکی اور شرافت سے بالکل عاری تھے۔

ان دو گروہوں کے درمیان ایک تیسرے ایسے گروہ نے بھی جنم لیا جو اپنی ذات میں ان دونوں کی خصوصیات جمع کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک طرف تو معرفت الٰہی کے شیریں عنصر سے محروم ہونا گوارا نہ تھا مگر دوسری طرف جسم کی لذتوں اور دنیا کی دلچسپیوں اور دنیوی معاملات چلانے کی ذمہ داریوں کو تیاگ دینے پر بھی وہ راضی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن دنیا جن مذاہب سے آشنا تھی اُن میں اس بیچ کے طرزِ عمل کے لیے کوئی رہنمائی موجود نہ تھی اور ان کے پیشواؤں نے اس کے لیے کوئی عملی نمونہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس لیے اس تیسرے گروہ نے ایک ہی شخصیت کے اندر دو متضاد انسان پالنے شروع کیے۔ ایک وہ انسان جو روحانی کیف و مستی کا آرزومند ہو اور اس کے حصول کے لیے مذہب کے ساتھ تعلقِ خاطر پیدا کرے۔ اور دوسرا وہ انسان جو دنیوی امور کو خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے دیکھے اور اس کے مطابق انہیں طے کرے اور زندگی کے دنیوی دائرے میں کسی اخلاقی یا روحانی احساس کو اثر انداز نہ ہونے دے۔ چنانچہ ان مذاہب کے پیرووں میں اسی تضاد کی مظہر لاتعداد شخصیتیں اُبھر کر سامنے آئیں اور انہوں نے مذہب کی اثر انگیزی کے دائرے کو یہاں تک محدود کر کے رکھ دیا کہ چند مذہبی رسوم کی بجا آوری کے سوا مذہب کا کوئی نشان دنیوی معاملات میں باقی

نہ رہا۔ انسان کی اجتماعی زندگی مذہب اور اس کے اثرات سے یکسر بیگانہ ہوگئی۔ اگر کبھی مذہبی آدمی نے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی تو لوگوں کے مذہبی احساسات کو سخت دھچکا لگا اور انھوں نے یہ کہہ کر اس کی راہ روکنے کی کوشش کی کہ ایک پاکیزہ روح انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو شیطانی کاموں میں الجھا رہا ہے۔ پھر بھی اگر وہ باز نہ آیا تو اس کے بارے میں باور کر لیا گیا کہ یہ شخص مذہب کے مقدس نام پر دنیا کمانا چاہتا ہے اس لیے یہ سخت نفرت و حقارت کا مستحق ہے۔ ان مذہبی تصورات کے لحاظ سے شاید اس سے بڑھ کر ناقابلِ معافی گناہ کوئی نہیں رہا ہے کہ ایک دیندار آدمی عالمِ بالا سے لو لگانے کے بجائے دنیا کے معاملات نمٹانے میں لگ جائے

انسانی زندگی کے بارے میں یہ سارے نظریات مذہب کے اس اساسی تصور کے شاخسانے ہیں جس کے مطابق روح اور جسم کا تعلق طائر اور قفس کا سا ہے۔ اسلام اس تصور کو بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہے اور یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان تعلق کی بنیاد عداوت اور مخاصمت نہیں بلکہ تعاون اور حمایت کی ہے۔ روح اپنی بالیدگی کے لیے جسم کی محتاج ہے اور جسم اپنی طہارت کے لیے روح کی پاکیزگی کا رہینِ منت ہے۔ اس بنا پر صحیح قسم کا مذہبی احساس پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کو اپنا دشمن اور حریف سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار رہیں۔

فلسفۂ مذہب کے ایک نامور مصنّف نے اپنی عالمانہ تصنیف "عبادت" میں مذہب کے بارے میں ان دونوں تصورات کے مابین فرق کے اصل وجوہ بھی بیان کیے ہیں۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ مذہب کے پہلے تصور کے مطابق، جو جسم اور روح کی باہمی دشمنی سے عبارت ہے، روحانیت کی معراج یہ ہے کہ روح سارے مادی علائق سے اپنے آپ کو منقطع کر کے خالق اور مالک سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کے برعکس دین کا دوسرا تصور جس کی رو سے روح اور جسم ایک دوسرے کے معاون ہیں، بندگیِ رب کے نظریہ پر قائم ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مذہب کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کا انتہائی فرماں بردار بندہ بن کر رہے اور ان ساری ذمہ داریوں سے اس کے حکم کے مطابق عہدہ برآ ہوسک

کوشش کرے جو خالق کی طرف سے اس پر بحیثیت بندے کے عائد ہوتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق روحانی ترقی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانی روح خالق میں کھو جائے کیونکہ اگر بندے اور رب کے درمیان امتیاز باقی نہ رہے تو پھر بندہ بندگی رب کے تقاضوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے۔ وہ مالک الملک کا اسی صورت میں بندہ بن کر رہ سکتا ہے جب اس کے اندر اس امر کا پوری طرح احساس باقی رہے کہ وہ خالق و مالک کا محض ایک بندہ ہے۔ مذہب کے اس تصور کے مطابق معرفتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا شعور بھی انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس عرفان کے بغیر خدا اور بندے کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

مذہب کے متعلق ان دونوں نظریات کے درمیان جو اساسی فرق ہے اگر اسے سمجھ لیا جائے تو پھر اسلام کی دعوت اور اس دعوت کی روشنی میں جماعت اسلامی کے موقف اور طریق کار اور ملک کی سیاست سے اس کی دلچسپی کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ جب ایک انسان مذہب کے اس تصور کو قبول کرکے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے کہ اس کا اپنے خدا کے ساتھ تعلق دراصل اطاعت اور بندگی کا تعلق ہے تو پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اپنی روح کو خداوند تعالیٰ کی اطاعت پر آمادہ نہ کرے بلکہ اپنے جسم کو بھی خالق و مالک کی فرمانبرداری کی تربیت دے۔ کیونکہ انسان رُوح اور جسم دونوں کے ارتباط کا نام ہے اگر انسانی رُوح خدا کی اطاعت کی طرف مائل ہو مگر جسم اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہو تو بندگی رب کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اس لیے کہ روح جسم کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور جسم رُوح سے الگ ہو کر کسی کام کا نہیں رہتا۔ اسلام رُوح کو قفسِ عنصری کا قیدی سمجھ کر اسے آزاد کرانے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ جسم کا معاون سمجھ کر اسے بھی پاکیزہ بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اکیلی روح یا تنہا جسم دونوں میں سے ایک بھی ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر یا ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن کر بندگی رب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اگر اسلام کا مقصد صرف روحانی کیف و مستی کا حصول ہوتا تو وہ یقیناً روح کو جسم کی کثافتوں سے محفوظ رکھنے پر زور دیتا اور اسے اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ اس قفس کی تیلیوں کو

زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کی کوشش کرے لیکن جو دین انسانی زندگی کا مقصد بندگیٔ رب قرار دیتا ہے وہ رُوح اور جسم دونوں کو خداشناس بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دیکھیے کہ ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا خوفی کا جو احساس روح کے اندر پیدا ہوا ہے اس کا اظہار انسانی عمل سے بھی ہو۔ اسی طرح نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نماز روح کی طہارت کا التزام ہے اور زکوٰۃ مادّی دولت کی پاکیزگی کا سامان ہے۔

اسلام نے رُوح کے تزکیہ اور جسم کی طہارت دونوں کو بندگیٔ رب کے لیے جس طرح ضروری سمجھا ہے اس کا اندازہ کتب حدیث کی اس ترتیب سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جسے ان کی تدوین میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ حدیث کا قریب قریب ہر مجموعہ کتاب الایمان سے شروع ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے اللہ کی اطاعت اور بندگی کے لیے سب سے پہلی شرط روح کی پاکیزگی اور طہارت ہے۔ اس حصے میں خدا، آخرت، حشر و نشر، نبوت، ملائکہ سب کے بارے میں غلط تصورات کی تردید اور صحیح عقائد کی صراحت ملتی ہے تاکہ ایک بندۂ مومن سب سے پہلے اپنی رُوح کی کثافتوں کو دُور کر کے اسے اللہ کی بندگی جیسے مقدس فرض کے لیے آمادہ کرے۔ کتاب الایمان کے بعد فوراً کتاب الطہارت شروع ہوتی ہے جس کا مرکز و محور جسم کی پاکیزگی ہے۔ اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ ہے جو پھر روح کی بالیدگی کے لیے سب سے پہلی عملی تربیت ہے۔ اور پھر کتاب الزکوٰۃ جو مال و دولت اور مادّی وسائل یا دوسرے لفظوں میں اُمورِ دنیا یا مادّی زندگی کے بارے میں روحانی احساس اور اخلاقی ذمہ داری پیدا کرنے کا لائحہ عمل ہے۔ قرآن مجید اور حدیث کی ان تصریحات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اصل روحانیت مادّی زندگی کے علائق کو توڑنا نہیں بلکہ خود مادّی علائق میں روحانی لطافت پیدا کرنا ہے تاکہ رُوح اور جسم دونوں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن کر بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کریں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسانی روح تو معرفت الٰہی کے اُونچے سے اُونچے مقامات تک پرواز کر کے تقرب باری تعالیٰ حاصل کرے اور جسم یا تو مادّہ پرستی کی آلائشوں میں ملوث رہے، یا پھر معرفت کا کوئی اثر جسم پر مترتب نہ ہو۔ اسلام روح اور جسم دونوں کا یک

ساتھ تزکیہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور دونوں کو بارگاہِ الٰہی میں فائز المرام دیکھنا چاہتا ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ اس نے زندگی کے اُس حصے کو جسے معرفتِ الٰہی کے شیدائی بالکل تاریک حصہ خیال کر کے اس کے نام سے بھی وحشت محسوس کرتے تھے، اس کے اندر عرفانِ ربانی کی قندیلیں روشن کر کے اسے روح کی طرح منور کر دیا۔ یہ امتیاز اسلام اور صرف اسلام کو حاصل ہے۔

رُوح اور جسم کی یکساں پاکیزگی کے اسی تصور پر اسلام نے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت دی ہے۔ اگر فرد کو بمنزلہ روح اور معاشرے کو جسم سمجھ لیا جائے تو اسلام کا پورا نظامِ حیات سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسلام بنیادی طور پر تو ایک فرد کی اصلاح چاہتا ہے کیونکہ فرد ہی وہ اکائی ہے جس سے معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ جب تک فرد، جو کسی معاشرے کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے روحانی اور اخلاقی احساسات سے بہرہ مند نہیں ہوتا اس وقت تک کسی پاکیزہ اجتماعی زندگی کی بنیاد نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہاں تک تو اسلام اور دوسرے مذاہب کسی نہ کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں لیکن اختلاف اور شدید اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جس طرح روح کی پاکیزگی کے لیے جسم کی پاکیزگی ضروری ہے، کیونکہ اگر جسم ٹھیک طریق سے پاکیزہ نہ ہو تو روح کی لطافت مجروح ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اسلام فرد کے روحانی نشوونما کے لیے یہ ناگزیر سمجھتا ہے کہ جس اجتماعی ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اسے بھی گندگیوں سے پاک اور روحانی اور اخلاقی احساسات سے معمور کر دیا جائے تاکہ فرد کے ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر نیکی اور شرافت سے لبریز ہوا داخل ہو جو اس کی روحانیت کے لیے تقویت کی باعث بنے۔ جس طرح رُوح جسم کی کثافتوں سے بوجھل ہوتی، اور جسم کی پاکیزگی سے لطافت اخذ کرتی ہے بالکل اسی طرح ہر فرد اجتماعی ماحول سے اثرات قبول کرتا ہے۔ ماحول کی گندگیاں اُس کے افکار و نظریات اور اس کے اخلاق و عادات پر برابر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ خواہش اور آرزو کے باوجود ان سے اپنے آپ کو بچا کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی اجتماعی ماحول نیکی، خدا ترسی فکر و نظر کی پاکیزگی سے معطر ہے تو جو فرد بھی اس میں زندگی بسر کر رہا ہو وہ لازمی طور پر اس روح افزا اور فرحت بخش فضا سے

اچھے اثرات قبول کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی فرد کے اردگرد کا ماحول، فحاشی، بے حیائی، لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم اور فسق و فجور سے بھرا ہوا ہو تو کوئی فرد تمنا اور آرزو کے باوجود اپنے دامن کو اس سے بچا کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ خود برائی کے ان کاموں سے مجتنب بھی رہے تو اس کا تعفن بہرطور اس کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ گلاب کے پھول گندگی کے ڈھیروں میں نہیں مہکتے کیونکہ وہ فضا انھیں راس نہیں آتی۔ وہ اپنی بہار لطیف اور پاکیزہ فضا ہی میں دکھلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام فرد کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے پاکیزہ اور سازگار ماحول پیدا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ جس طرح کوئی صاف ستھرا ذوق رکھنے والا انسان کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سامنے غلاظت کے ڈھیر پڑے رہیں اور ان سے اس کی طبیعت کے اندر کوئی کراہت نہ پیدا ہو، بالکل اسی طرح اسلامی روحانیت کا لذت آشنا ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ جس اجتماعی ماحول میں زندہ ہے اس میں برائی اور ظلم و ستم کا دور دورہ ہو اور اس کی روحانیت کو اس تشویشناک صورتِ حال سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق روح کو کوئی ایسا ہوا بند گوشہ میسر نہیں آسکتا جو ماحول کے اثرات سے یکسر مامون ہو۔ اس بنا پر روحانیت کی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کو پاکیزہ بنانے کی فکر کی جائے۔

یہ سادہ سی حقیقت ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور یہی سیدھی سی بات ہے جسے جماعت اسلامی نے اپنی دعوت کی بنیاد بنایا ہے۔ یہ دعوت ہمارے اپنے ذہن کی اختراع نہیں۔ یہ کوئی بدعت نہیں جو جماعت اسلامی کے لوگوں نے خود اپنے دماغ سے گھڑلی ہو، بلکہ یہ کائنات کی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جسے تمام انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۂ توبہ: ۳۱)

وہ اس کے سوا کسی بات پر مامور نہیں کیے گئے کہ رب ایک معبود کی بندگی کریں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ پاک ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔

بندگی صرف نماز ادا کرنے اور روزے رکھنے کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کو اطاعتِ خداوندی میں گزارنے کا نام ہے۔ بندگیِ خدا کے بارے میں ایک خاص طرزِ فکر اور ایک مخصوص طرزِ عمل کی طالب ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان جس خالق و مالک کو اپنا معبود اور الٰہ تسلیم کر رہا ہے اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کی بادشاہی اور حاکمیت میں کسی دوسرے کو فکر و عمل کے اعتبار سے شریک نہ ٹھیرائے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ بندگیِ رب کے تقاضے پورے کرنے کے لیے صرف یہی بات ہی کافی نہیں کہ انسان خدا کا مطیع و فرمانبردار ہونے کا دعویٰ کرے۔ . . . . ـــ بلکہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ ہر اس عقیدے اور ہر اس تصور اور عمل سے اجتناب کرے جو خدا کی اطاعت اور بندگی کی ضد ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۚ (سورۂ نحل: ۳۶)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا (اس دعوت اور پیغام کے ساتھ) کہ اللہ کی بندگی کرو، اور ہر جھوٹے خدا (کی عبادت اور بندگی) سے بچو۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم سارے باطل خداؤں سے یکسر منہ موڑ کر اپنے آپ کو خدائے واحد کی غلامی میں دے دو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی کسی معبودِ باطل کی بندگی اختیار نہ کرو۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں قرآنِ مجید نے نہایت واضح طور پر بندگیِ رب کا مفہوم متعین کر دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۔ (سورۂ البقرۃ: ۲۰۸)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

پوری زندگی کو اسلام کے دائرے میں لے آنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، ثقافت، سیاست، معیشت، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کو اسلام کے حدود کا پابند بنا دیا جائے۔ اسی سے بندگیِ رب کے تقاضے پورے ہوتے ہیں کیونکہ اگر زندگی کا کوئی

گوشہ بھی اللہ کی اطاعت سے باہر اور غیر اللہ کا تابع رہ جاتے تو اس سے زندگی کے اندر وہ توحید قائم نہیں ہوتی جسے اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

جماعت اسلامی کی دعوت درحقیقت اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کی دعوت ہے اور اس کا لائحہ عمل اِعْبُدُوا اللہ کی وہی عملی تفسیر ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صلحاءِ امت نے پیش کی ہے۔ اس کی دعوت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دعوت، آخرت کی جوابدہی کا خوف، حشر و نشر، الغرض دینی معتقدات پر پختہ اور غیر متزلزل یقین شامل ہے۔ اس کے پروگرام میں باطل افکار و نظریات کی تردید، صحیح عقائد کی تلقین، نیک اور صالح اعمال کی ترغیب اور غیر اسلامی رجحانات اور افعال و اعمال کی اصلاح داخل ہے۔ اس نے اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کے تعارف کے لیے جو لٹریچر پیدا کیا ہے اسے ایک نظر دیکھنے سے اس کے پیغام اور کام کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس لٹریچر میں باطل عقائد، نظریات اور لادینی رجحانات کی تردید بھی ملتی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر و نفوذ نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو نئے نئے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا کی ہیں ان کا صحیح تجزیہ اور پھر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل بھی ملتا ہے اور مسلمانوں کو از سرِ نو اسلام کی بنیاد پر اپنی زندگی اُستوار کرنے کے لیے عملی رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ عقائد، عبادات، معیشت، معاشرت، سیاست، الغرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام جمع نہ کر دیئے گئے ہوں۔ انسانی زندگی جن افکار و احساسات سے عبارت ہے اور وہ جن گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے ان سب کے بارے میں جماعت اسلامی نے قرآن و سنّت کی تعلیمات کو موجودہ دَور کے علمی تقاضے سامنے رکھ کر پیش کر دیا ہے تاکہ اس زمانے کا انسان اس زمانے کے حالات میں اسلام کی صحیح پیروی کر سکے۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلامی عبادات پر ایک نظر، رسالہ دینیات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، خطبات، تنقیحات، تفہیمات، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی ریاست، الجہاد فی الاسلام۔ یہ ساری کتابیں اسلامی عقائد و اعمال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں اور

جماعت اسلامی کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں نے نہ صرف قلب و دماغ کی تطہیر میں مدد دی ہے بلکہ ان کے اندر ایمان کی شمع بھی فروزاں کی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ نسل جسے مغربی افکار کا طوفان بڑی سرعت کے ساتھ بہا کر لیے جا رہا ہے اسے اپنے بچاؤ کے لیے اس لٹریچر سے ہی کافی حد تک سہارا ملا ہے۔

یہ جماعت اسلامی کے کام اور اس کے وسیع پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اس کا دوسرا حصہ مسلمانوں کو عملاً اللہ کی بندگی پر آمادہ کرنا اور طاغوت سے ان کا رشتہ منقطع کر کے اسے خدائے واحد لاشریک کے ساتھ جوڑنا ہے، کیونکہ جب تک غیر اللہ کی غلامی سے کسی انسان کو نجات نہیں ملتی اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں خدائے واحد کی غلامی اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں داخل ہوتے ہوئے جس عظیم حقیقت کا کسی انسان سے اعتراف کرایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان سب سے پہلے اس امر کا احساس کرے کہ سچے خدا کے ساتھ دنیا نے کچھ معبودانِ باطل بھی گھڑ رکھے ہیں جن کی عقیدت و محبت اور بندگی و اطاعت میں لوگ گرفتار ہوتے رہے ہیں اور مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان ان جھوٹے خداؤں کی نفی کر کے صرف ایک معبودِ حقیقی کو اپنا رب تسلیم کرے۔ اس بنا پر خدا کی محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے قلب و دماغ کے سارے گوشوں میں سے غیر اللہ کی محبت مٹا دے۔ یہی چیز طاغوت سے قطع تعلق ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ - ۲۵۶)۔ جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاغوت سے کفر اور اللہ پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا اور طاغوت دونوں سے آدمی کا رشتہ جڑا رہے اور پھر بھی وہ مسلمان ہو۔

طاغوت صرف انسان کے دل و دماغ پر ہی مسلط ہو کر نہیں بیٹھا رہتا بلکہ وہ زندگی کے سارے میدانوں پر قبضہ کر کے ہر جگہ غیر اللہ کی حکومت قائم کرتا ہے اور برابر اس امر کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اسلامی اقتدار کا پوری طرح قلع قمع ہو۔ وہ دین کے ایک ایک نقش کو مٹاتا اور اس کے معمولی سے معمولی اثرات کو پوری قوت سے

زائل کرتا ہے۔ اور ان میدانوں میں بھی وہ خاص طور پر بڑی ذہانت کے ساتھ قوت و طاقت کے اصل مراکز کو براہِ راست اپنی تحویل میں لیتا ہے تاکہ انسانی زندگی پر اس کا تسلط پوری طرح قائم ہو اور قائم رہے۔

ظاہر بات ہے کہ اسلام کو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں پر حاوی کرنے کے لیے جب بھی جدوجہد کی جائے گی تو سب سے پہلے اس امر کی کوشش کرنی ہوگی کہ قوت کے اصل مراکز کو طاغوت کے قبضے سے نکال لیا جائے کیونکہ اگر یہ مراکز اس کے ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر اس کا تسلط زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جماعت اسلامی کی سیاسی سرگرمیاں، جن کی وجہ سے اُسے ہوسِ اقتدار اور دنیا پرستی اور دین سے انحراف اور محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ جانے کے طعنے دیئے جاتے ہیں، دراصل اجتماعی اقتدار کے مراکز کو طاغوت کی گرفت سے نکالنے ہی کی کوششیں ہیں۔ اسلام اگر دین نہ ہوتا بلکہ محض گیان دھیان یا چند مذہبی رسوم کا مجموعہ یا روحانی کیف و مستی کے حصول کا ذریعہ ہوتا تو پھر واقعی اجتماعی معاملات میں کسی مسلمان کی دخل اندازی یا سیاسی سرگرمیوں میں شرکت گناہِ عظیم ہوتی، کیونکہ دنیا داری کے یہ سارے دھندے مراقبے اور مکاشفے کی راہ میں حائل ہونے والے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ خدا نے انسان سے بندگی کا مطالبہ کیا ہے اور بندگی کے لیے یہ شرط ضروری قرار دی ہے کہ اس کی غلامی میں آنے سے پہلے طاغوت کی غلامی سے اپنے آپ کو یکسر آزاد کر لیا جائے۔ لہٰذا ایک شخص کے صحیح معنوں میں مومن و مسلم بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے جن حصوں پر بھی طاغوت کا قبضہ ہے ان حصوں کو اس کی گرفت سے نکالا جائے اور پھر انہیں اسلام کے تابع بنایا جائے تاکہ پوری زندگی بندگیٔ رب کی مظہر ہو۔

جماعت اسلامی بلاشبہ سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہوتی ہے، مگر اس کے پیشِ نظر اقتدار کے ہاتھوں کی تبدیلی یا اپنے کارکنوں کے لیے کوئی دنیاوی مراعات یا اونچے مناصب کا حصول نہیں ہے۔ اُس کی شرکت کا محرک صرف دینی مقصد ہے۔ وہ ان سیاسی کاموں میں اُسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتی ہے جس کے ساتھ نماز اور دوسرے دینی فرائض سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ عقیدے

اور زبانی اقرار اور چند مخصوص مذہبی اعمال کی حد تک تو ہم مسلمان ہوں مگر ہماری تعلیم، تہذیب، تمدن، سیاست، معیشت، قانون، نظم ونسق، اور وسائلِ نشر و اشاعت پر شیطان کی حکمرانی قائم رہے۔ جب انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ خدائے واحد کی مخلوق ہے اور اس بنا پر اسی کا تابع ہے تو اس حقیقت کا شعور و احساس رکھتے ہوئے وہ کبھی یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ قوت و طاقت کے سارے سرچشموں اور اثر و اقتدار کے تمام مراکز کو وہ شیطان کے ہاتھ میں دے دے تاکہ وہ زندگی کے ایک ایک گوشے کو مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ کفر و الحاد سے سیراب کرتا رہے۔ اگر مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ قوت و طاقت کے ان سرچشموں کو خدا فراموش لوگوں کے تصرف سے نکال کر اُن لوگوں کے تصرف میں دینے کی کوشش نہ کریں جو انہیں اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے کا مقدس عزم رکھتے ہوں۔ یہ کوشش دنیاداری نہیں بلکہ عین دینداری ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کوشش میں تساہل دینداری نہیں ہے۔

غور کیجیے، آخر جس کام کو یہ لوگ سیاسی کام کہتے ہیں وہ کس اعتبار سے شجرِ ممنوعہ ہے۔ سیاست دراصل اجتماعی زندگی کی وہ قوتِ قاہرہ ہے جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو جس نہج پر چاہتی ہے ڈھال لیتی ہے۔ کسی قوم کی سیاسی ہیئت یوں تو شروع ہی سے اجتماعی زندگی کی تشکیل میں غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی ہے لیکن دورِ جدید میں اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور اس کا دائرۂ کار غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے سیاست کا میدان قدرے محدود تھا۔ لیکن اس انقلاب کے بعد جب اجتماعی زندگی کے گوشے دور دراز تک پھیل گئے تو اس اجتماعی ہیئت میں بھی ہمہ گیر طاقت و وسعت پیدا ہو گئی جو ان گوشوں کے درمیان نظم و ضبط پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس بنا پر ریاست اور مملکت کی طاقت اور اس کے دائرۂ کار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور سیاسی معاملات کی اثر آفرینی بھی ناقابلِ بیان حد تک بڑھ گئی ہے جو فرد یا جماعت اجتماعی قوت و طاقت کے اس مرکز کو نظر انداز کرتی ہے وہ زندگی میں اپنی مرضی کا کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتی بلکہ اپنی مرضی کے خلاف انقلاب کے برپا ہونے کو روک بھی نہیں سکتی۔

آپ زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ آخر یہ کس قوت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ملک کا نظامِ تعلیم خدا کے پرستار اور اسلام کے علمبردار پیدا کرنے کے بجائے خدا کے باغی پیدا کر رہا ہے۔ ملک کا نظامِ معیشت مخلوقِ خدا کو راحت اور آرام پہنچانے کے بجائے اس کی زندگی کو عذاب بنا رہا ہے اور جو حرام خور نہیں بننا چاہتے ان تک کو حرام خوری پر مجبور کر رہا ہے۔ ملک کا نظامِ معاشرت انسانوں کے مابین محبت اور تعاون کی فضا قائم کرنے کے بجائے نفاق اور دشمنی کے بیج بو رہا ہے۔ ملک کی انتظامیہ پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جو اس قوم کو کوئی دشمن قوم خیال کرتے ہوئے بڑی سنگدلی کے ساتھ اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ ملک میں زبردستی وہ ثقافت لائی جا رہی ہے جو روز بروز بے حیائی اور فسق و فجور کو ترقی دیتی چلی جا رہی ہے۔ اس ساری صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے کسی گوشے میں بھی اسلام کا عمل دخل نہیں رہا ہے بلکہ اس پر غیر اسلامی قوتیں قابض ہیں۔ یہاں قدرتی طور پر انسان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جس ملک کی عظیم اکثریت اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام کو ایک حکمران قوت دیکھنے کی بھی آرزو مند ہے اس کے ہاں غیر اسلامی افکار و اعمال اور غیر اسلامی نظامِ حیات پرورش پا رہا ہو؟ اس کا سبب ایک ہی ہے کہ وہ مرکزی قوت جو اجتماعی زندگی کے اِن شعبوں کی تشکیل کی ذمہ دار ہے اس پر غیر اسلامی قوتوں کا قبضہ ہے۔ قوت کے اس مرکز کو خدا ترس ہاتھوں میں منتقل کرنے کی کوشش کو آخر کس طرح دنیا پرستی کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا خدا پرستی کے معنی یہی ہیں کہ دنیا پر خدا سے بغاوت چھاتی چلی جائے اور آپ بس اللہ اللہ کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں؟

پاکستان کی نہیں بلکہ پورے دنیائے اسلام بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ پوری انسانیت کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ایک مختصر سی خدا ناشناس اقلیت نے اس مرکزی قوت پر بالکل ناجائز تسلط قائم کر رکھا ہے جو اجتماعی زندگی کی صورت گری کرتی ہے۔ آپ اخلاقی انحطاط کے اس زمانے میں بھی انسانوں کے دلی جذبات کا جائزہ لیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انسانوں کی عظیم اکثریت روحانی سکون، قلبی اطمینان، معاشرتی عدل و انصاف اور آزادی کی دل و جان سے متمنی ہے۔ مگر اس آرزو کے باوجود اسے ان میں

تفہیم القرآن

اَلتَّغَابُن

(۲)

* پس ایمان لاؤ اللہ پر، اور اُس کے رسول پر، اور اُس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے[۱۸]۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (اِس کا پتہ تمہیں اس روز چل جائے گا) جب اجتماع کے دن وہ تم سب کو اکٹھا کرے گا[۱۹]۔ وہ دن ہوگا ایک دوسرے کے مقابلے میں لوگوں کی ہار جیت کا[۲۰]۔ جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک

---

[۱۸] یعنی جب یہ واقعہ ہے اور پوری انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ قوموں کی تباہی کا اصل موجب اُن کا رسولوں کی بات نہ ماننا اور آخرت کا انکار کرنا تھا، تو اُسی غلط روش پر چل کر اپنی شامت بلانے پر اصرار نہ کرو اور اللہ اور اس کے رسول اور قرآن کی پیش کردہ ہدایت پر ایمان لے آؤ۔ یہاں سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ روشنی سے مراد قرآن ہے۔ جس طرح روشنی خود نمایاں ہوتی ہے اور گرد و پیش کی اُن تمام چیزوں کو نمایاں کر دیتی ہے جو پہلے تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں، اسی طرح قرآن ایک ایسا چراغ ہے جس کا برحق ہونا بجائے خود روشن ہے، اور اس کی روشنی میں انسان ہر اُس مسئلے کو سمجھ سکتا ہے جسے سمجھنے کے لیے اس کے اپنے ذرائع علم و عقل کافی نہیں ہیں۔ یہ چراغ جس شخص کے پاس ہو وہ فکر و عمل کی بے شمار پُر پیچ راہوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ صاف صاف دیکھ سکتا ہے اور عمر بھر صراطِ مستقیم پر اس طرح چل سکتا ہے کہ ہر قدم پر اُسے یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ گمراہیوں کی طرف سے جانے والی پگ ڈنڈیاں کدھر کدھر جا رہی ہیں اور ہلاکت کے گڑھے کہاں کہاں آ رہے ہیں اور سلامتی کی راہ ان کے درمیان کونسی ہے۔

[۱۹] اجتماع کے دن سے مراد ہے قیامت، اور سب کو اکٹھا کرنے سے مُراد ہے تمام اُن انسانوں کو بیک وقت زندہ کر کے جمع کرنا جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہوئے ہوں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں جگہ جگہ

کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں فرمایا ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ، "وہ ایک ایسا دن ہوگا جس میں سب انسان جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہوگا سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا (آیت ۱۰۳)" اور سورۂ واقعہ میں فرمایا قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ "ان سے کہو کہ تمام پہلے گزرے ہوئے اور بعد میں آنے والے لوگ یقیناً ایک مقرر دن کے وقت جمع کیے جانے والے ہیں (آیت ۵۰)"

؂ اصل میں لفظ يَوْمُ التَّغَابُنِ استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ اردو زبان تو کیا کسی دوسری زبان کے بھی ایک لفظ، بلکہ ایک فقرے میں اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ پرمعنی نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابن غبن سے ہے جس کا تلفظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی۔ غَبْن زیادہ تر خرید و فروخت اور لین دین کے معاملہ میں بولا جاتا ہے، اور غَبَن رائے کے معاملہ میں۔ لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں: غَبَنُوا خَيْرَ النَّاقَةِ "ان لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ ان کی اونٹنی کہاں گئی"۔ غَبَنَ فُلَانًا فِى الْبَيْعِ "اس نے فلاں شخص کو خرید و فروخت میں دھوکا دے دیا"۔ غَبَنَ فلانًا "اس نے فلاں شخص کو گھاٹا دے دیا"۔ غَبِنْتُ مِنْ حَقِّي عِنْدَ فُلَانٍ "فلاں شخص سے اپنا حق وصول کرنے میں مجھ سے بھول ہو گئی"۔ غَبِيْن، "وہ شخص جس میں ذہانت کی کمی ہو اور جس کی رائے کمزور ہو"۔ مَغْبُون "وہ شخص جو دھوکا کھا جائے"۔ الغبن، الغفلة، النسيان، فوت الحظ، ان يبخس صاحبك فى معاملة بينك وبينه لضرب من الاخفاء "غبن کے معنی ہیں غفلت، بھول، اپنے حصّے سے محروم رہ جانا، ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملہ میں دوسرے کو نقصان دینا"۔ امام حسن بصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو بیع میں دھوکا دے رہا ہے تو فرمایا هٰذا يَغْبِنُ عَقْلَكَ "یہ شخص تجھے بیوقوف بنا رہا ہے"۔

اس سے جب لفظ تغابن بنایا جائے تو اس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ تَغَابَنَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا۔ یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا جانا۔ یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا

اور اُس کا اپنے حصے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اٹھالے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

اب اِس بات پر غور کیجیے کہ آیت میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ، "وہ دن ہوگا تغابُن کا"۔ اِن الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب و روز تغابُن ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن یہ تغابُن ظاہری اور نظر فریب ہے، اصلی اور حقیقی تغابُن نہیں ہے۔ اصل تغابُن قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے اٹھایا اور کون نفع کمائے گیا۔ اصل میں کس کا حصّہ کسے مل گیا اور کون اپنے حصّے سے محروم رہ گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالہ نکال دیا، اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لُوٹ لیے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

مفسّرین نے یوم التغابُن کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے متعدد مطلب بیان کیے ہیں جو سب کے سب صحیح ہیں اور اس کے معنی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض مفسّرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اُس روز اہلِ جنت اہلِ دوزخ کا وہ حصّہ مار لے جائیں گے جو اُن کو جنت میں ملتا اگر وہ جنتیوں کے سے کام کر کے آئے ہوتے، اور اہلِ دوزخ جنتیوں کا وہ حصّہ لوٹ لیں گے جو انہیں دوزخ میں ملتا اگر انہوں نے دنیا میں دوزخیوں کے سے کام کیے ہوتے۔ اس مضمون کی تائید بخاری کی وہ حدیث کرتی ہے جو انہوں نے کتاب الرّقاق میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص بھی جنت میں جائے گا اُسے وہ مقام دکھایا جائے گا جو اُسے دوزخ میں ملتا اگر وہ بُرا عمل کرتا، تاکہ وہ اور زیادہ شکر گزار ہو۔ اور جو شخص بھی دوزخ میں جائے گا اسے وہ مقام دکھا دیا جائے گا جو اُسے جنت میں ملتا اگر اس نے نیک عمل کیا ہوتا، تاکہ اسے اور زیادہ حسرت ہو"۔

بعض اور مفسّرین کہتے ہیں کہ اُس روز ظالم کی اُتنی نیکیاں مظلوم لوٹ لے جائے گا جو اس کے ظلم کا بدلہ ہو سکیں، یا مظلوم کے اُتنے گناہ ظالم پر ڈال دیے جائیں گے جو اس کے حق کے برابر وزن رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ قیامت کے روز آدمی کے پاس کوئی مال و زر تو ہوگا نہیں کہ وہ مظلوم کا حق ادا کرنے کے لیے کوئی ہرجانہ یا تاوان

دے سکے۔ وہاں تو بس آدمی کے اعمال ہی ایک زرِ مبادلہ ہوں گے۔ لہٰذا جس شخص نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا ہو وہ مظلوم کا حق اسی طرح ادا کر سکے گا کہ اپنے پلّے میں جو کچھ بھی نیکیاں رکھتا ہو ان میں سے اس کا تاوان ادا کرے، یا مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ اپنے اوپر لے کر اس کا جرمانہ بھگتے۔ یہ مضمون بھی متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ بخاری، کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جس شخص کے ذمہ اپنے کسی بھائی پر کسی قسم کے ظلم کا بار ہو اُسے چاہیے کہ یہیں اس سے سبکدوش ہو لے، کیونکہ آخرت میں دینار و درہم تو ہوں گے ہی نہیں۔ وہاں اس کی نیکیوں میں سے کچھ لے کر مظلوم کو دلوائی جائیں گی، یا اگر اس کے پاس نیکیاں کافی نہ ہوں تو مظلوم کے کچھ گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔" اسی طرح مُسند احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ بن اُنیس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "کوئی جنتی جنت میں اور کوئی دوزخی دوزخ میں اس وقت تک نہ جا سکے گا جب تک کہ اُس ظلم کا بدلہ نہ چکا دیا جائے جو اس نے کسی پر کیا ہو، حتیٰ کہ ایک تھپڑ کا بدلہ بھی دینا ہوگا۔" ہم نے عرض کیا کہ یہ بدلہ کیسے دیا جائے گا جبکہ قیامت میں ہم ننگے بُچّے ہوں گے؟ فرمایا "اپنے اعمال کی نیکیوں اور بدیوں سے بدلہ چکانا ہوگا۔"

مسلم اور مُسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو مُفلس کون ہوتا ہے؟" لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال متاع کچھ نہ ہو۔ فرمایا "میری اُمّت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز اور روزہ اور زکوٰۃ ادا کر کے حاضر ہوا ہو، مگر اس حال میں آیا ہو کہ کسی کو اس نے گالی دی تھی اور کسی پر بُہتان لگایا تھا اور کسی کا مال مار کھایا تھا اور کسی کا خون بہایا تھا اور کسی کو مارا پیٹا تھا۔ پھر ان سب مظلوموں میں سے ہر ایک پر اس کی نیکیاں لے لے کر بانٹ دی گئیں۔ اور جب نیکیوں میں سے کچھ نہ بچا جس سے ان کا بدلہ چکایا جا سکے تو ان میں سے ہر ایک کے کچھ کچھ گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے گئے، اور وہ شخص دوزخ میں پھینک دیا گیا۔" ایک اور حدیث میں، جسے مُسلم اور ابوداؤد نے حضرت بُریدہ سے نقل کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ "کسی مجاہد کے پیچھے اگر کسی شخص نے اس کی بیوی اور اس کے گھر والوں کے معاملہ میں خیانت کی تو قیامت کے روز وہ اُس مجاہد کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا اور اس کو کہا جائے گا کہ اس کی نیکیوں میں سے جو کچھ تو چاہے لے لے۔" پھر حضورؐ نے ہماری طرف

متوجہ ہو کر فرمایا "پھر تمہارا کیا خیال ہے" یعنی تم کیا اندازہ کرتے ہو کہ وہ اُس کے پاس کیا چھوڑ دے گا؟

بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ تغابن کا لفظ زیادہ تر تجارت کے معاملہ میں بولا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں جگہ جگہ اُس رویّے کو جو کافر اور مومن اپنی دنیا کی زندگی میں اختیار کرتے ہیں، تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مومن اگر نافرمانی کا راستہ چھوڑ کر اطاعت اختیار کرتا ہے اور اپنی جان، مال اور محنتیں خدا کے راستے میں کھپا دیتا ہے تو گویا وہ گھاٹے کا سودا چھوڑ کر ایک ایسی تجارت میں اپنا سرمایہ لگا رہا ہے جو آخر کار نفع دینے والی ہے۔ اور ایک کافر اگر اطاعت کی راہ چھوڑ کر خدا کی نافرمانی اور بغاوت کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو گویا وہ ایک ایسا تاجر ہے جس نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی ہے اور آخر کار وہ اس کا خسارہ اٹھانے والا ہے۔ دونوں کا نفع اور نقصان قیامت کے روز ہی کھلے گا۔ دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ مومن سراسر گھاٹے میں رہے اور کافر بڑے منافع حاصل کر رہا ہے۔ مگر آخرت میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ اصل میں نفع کا سودا کس نے کیا ہے اور نقصان کا سودا کس نے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ۔ آیات ۱۶۔ ۱۷۵-۲۰۷- آل عمران ۷۷-۱۷۷- النساء ۷۴- التوبہ ۱۱۱- النحل ۹۵- فاطر ۲۹- الصف ۱۰-

ایک اور صورت تغابن کی یہ بھی ہے کہ دنیا میں لوگ کفر و فسق اور ظلم و عصیان پر بڑے اطمینان سے آپس میں تعاون کرتے رہتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بڑی گہری محبت اور دوستی ہے۔ بدکردار خاندانوں کے افراد، ضلالت پھیلانے والے پیشوا اور اُن کے پیرو، چوروں اور ڈاکوؤں کے جتھے، رشوت خوار اور ظالم افسروں اور ملازمین کے گٹھ جوڑ، بے ایمان تاجروں، صنعت کاروں اور زمینداروں کے گروہ، گمراہی اور شرارت و خباثت برپا کرنے والی پارٹیاں، اور بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں ظلم و فساد کی علمبردار حکومتیں اور قومیں، سب کا باہمی ساز باز اسی اعتماد پر قائم ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والے افراد اس گمان میں ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بڑے اچھے رفیق ہیں اور ہمارے درمیان بڑا کامیاب تعاون چل رہا ہے۔ مگر جب یہ لوگ آخرت میں پہنچیں گے تو اُن پر یکایک یہ بات کھلے گی کہ ہم سب نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ جسے میں اپنا بہترین باپ، بھائی، بیوی، شوہر، اولاد، دوست، رفیق، لیڈر، پیر، مُرید، یا حامی و مددگار سمجھ رہا تھا وہ دراصل میرا بدترین دشمن تھا۔ ہر رشتہ داری اور دوستی اور عقیدت و محبت، عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب ایک دوسرے

عمل کرتا ہے[21]، اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے[22] وہ دوزخ کے باشندے ہونگے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے ۝
[23] کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے[24]۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے ع

کو گالیاں دینگے، ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ اپنے جرائم کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر اسے سخت سے سخت سزا دلوائے۔ یہ مضمون بھی قرآن میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے جس کی چند مثالیں حسبِ ذیل آیات میں دیکھی جا سکتی ہیں: البقرہ ۱۶۷۔ الاعراف ۳۸ تا ۳۹۔ ابراہیم ۲۱-۲۲۔ المومنون ۱۰۱۔ العنکبوت ۱۲-۱۳-۲۵۔ لقمٰن ۳۳۔ الاحزاب ۶۷-۶۸۔ سبا ۳۱ تا ۳۳۔ فاطر ۱۸۔ الصّٰفّٰت ۲۷ تا ۳۳۔ ص ۵۹ تا ۶۱۔ حٰم السجدہ ۲۹۔ الزُخرُف ۶۷۔ الدُخان ۴۱۔ المعارج ۱۰ تا ۱۴۔ عبس ۳۴ تا ۳۷۔

[21] اللہ پر ایمان لانے سے مراد محض یہ مان لینا نہیں ہے کہ اللہ موجود ہے، بلکہ اُس طریقے سے ایمان لانا مُراد ہے جس طرح اللہ نے خود اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے بتایا ہے۔ اس ایمان میں ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب آپ سے آپ شامل ہے۔ اسی طرح نیک عمل سے مراد بھی ہر وہ عمل نہیں ہے جسے آدمی نے خود نیکی سمجھ کر یا انسانوں کے کسی خود ساختہ معیارِ اخلاق کی پیروی کرتے ہوئے اختیار کر لیا ہو، بلکہ اس سے مراد وہ عملِ صالح ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق ہو۔ لہٰذا کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ رسُول اور کتاب کے واسطے کے بغیر اللہ کو ماننے اور نیک عمل کرنے کے وہ نتائج ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ قرآن مجید کا جو شخص بھی سمجھ کر مطالعہ کرے گا اُس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ قرآن کی رُو سے اِس طرح کے کسی ایمان کا نام ایمان باللہ، اور کسی عمل کا نام عملِ صالح سرے سے ہے ہی نہیں۔

[22] یہ الفاظ خود کفر کے مفہوم کو واضح کر دیتے ہیں۔ کتاب اللہ کی آیات کو اللہ کی آیات نہ ماننا، اور اُن حقائق کو تسلیم نہ کرنا جو ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں، اور اُن احکام کی پیروی سے انکار کر دینا جو اُن میں ارشاد ہوتے ہیں، یہی کفر ہے اور اس کے نتائج وہ ہیں جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔

[23] اب رُوئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے۔ اِس سلسلۂ کلام کو پڑھتے ہوئے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ

دل کو ہدایت بخشتا ہے۲۵، اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۲۶۔ اللہ کی اطاعت کرو اور رسُول کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے سخت مصائب کا زمانہ تھا۔ مکہ سے برسوں ظلم سہنے کے بعد اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آگئے تھے۔ اور مدینے میں جن حق پرستوں نے ان کو پناہ دی تھی اُن پر دُہری مصیبت آپڑی تھی۔ ایک طرف انہیں سینکڑوں مہاجرین کو سہارا دینا تھا جو عرب کے مختلف حصّوں سے اُن کی طرف چلے آرہے تھے، اور دوسری طرف پورے عرب کے اعدائے اسلام اُن کے درپے آزار ہو گئے تھے۔

۲۴ یہ مضمون سورۃ الحدید، آیات ۲۲-۲۳ میں بھی گزر چکا ہے اور وہاں حواشی نمبر ۳۹ تا ۴۲ میں ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ جن حالات میں اور جس مقصد کے لیے یہ بات وہاں فرمائی گئی تھی، اُسی طرح کے حالات میں اسی مقصد کے لیے اسے یہاں دُہرایا گیا ہے۔ جو حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نہ مصائب خود آجاتے ہیں، نہ دنیا میں کسی کی یہ طاقت ہے کہ اپنے اختیار سے جس پر جو مصیبت چاہے نازل کر دے۔ یہ تو سراسر اللہ کے اذن پر موقوف ہے کہ کسی پر کوئی مصیبت نازل ہونے دے یا نہ ہونے دے۔ اور اللہ کا اذن بہر حال کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے جسے انسان نہ جانتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔

۲۵ یعنی مصائب کے ہجوم میں جو چیز انسان کو راہِ راست پر قائم رکھتی ہے اور کسی سخت سے سخت حالت میں بھی اس کے قدم ڈگمگانے نہیں دیتی وہ صرف ایمان باللہ ہے جس کے دل میں ایمان نہ ہو وہ آفات کو یا تو اتفاقات کا نتیجہ سمجھتا ہے، یا دنیوی طاقتوں کو اُن کے لانے اور روکنے میں مؤثر مانتا ہے، یا انہیں ایسی خیالی طاقتوں کا عمل سمجھتا ہے جنہیں انسانی اوہام نے نفع و ضرر پہنچانے پر قادر فرض کر لیا ہے، یا خدا کو فاعلِ مختار مانتا تو ہے مگر صحیح ایمان کے ساتھ نہیں مانتا۔ اِن تمام مختلف صورتوں میں آدمی کم ظرف ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک خاص حد تک تو وہ مصیبت سہہ لیتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ ہر آستانے پر جھک جاتا ہے۔ ہر ذلت قبول کر لیتا ہے، ہر کمینہ حرکت کر سکتا ہے۔ ہر غلط کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خدا کو گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ حتیٰ کہ خودکشی تک کر گزرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص یہ جانتا اور سچے دل سے مانتا ہو کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی اِس کائنات کا مالک و فرمانروا ہے، اور اسی کے اذن سے مصیبت آتی اور اسی کے حکم سے ٹل سکتی ہے، اُس کے دل کو اللہ صبر و تسلیم اور رضا بقضاء کی توفیق دیتا ہے، اس کو عزم اور ہمت کے ساتھ ہر طرح کے

تم اطاعت سے منہ موڑتے ہو تو ہمارے رسول پر صاف صاف حق پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے

حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتا ہے، تاریک سے تاریک حالات میں بھی اس کے سامنے اللہ کے فضل کی امید کا چراغ روشن رہتا ہے، اور کوئی بڑی سے بڑی آفت بھی اس کو اتنا پست ہمت نہیں ہونے دیتی کہ وہ راہ راست سے ہٹ جائے، یا باطل کے آگے سر جھکا دے، یا اللہ کے سوا کسی اور کے در پر اپنے درد کا مداوا ڈھونڈنے لگے۔ اس طرح ہر مصیبت اس کے لیے مزید خیر کے دروازے کھول دیتی ہے اور کوئی مصیبت بھی حقیقت میں اس کے لیے مصیبت نہیں رہتی بلکہ نتیجے کے اعتبار سے سراسر رحمت بن جاتی ہے، کیونکہ خواہ وہ اُس کا شکار ہو کر رہ جائے یا اس سے بخیریت گزر جائے، دونوں صورتوں میں وہ اپنے رب کی ڈالی ہوئی آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلتا ہے۔ اسی چیز کو ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے عَجَبًا لِلْمُؤْمِنِ لَا يَقْضِي اللّٰهُ لَهُ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْرًا لَهُ، إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَلَيْسَ ذَالِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا الْمُؤْمِنِ "مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اللہ اس کے حق میں جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ مصیبت پڑے تو صبر کرتا ہے، اور وہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ خوشحالی میسر آئے تو شکر کرتا ہے، اور وہ بھی اس کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات مومن کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔"

۲۶؎ اِس سلسلۂ کلام میں اس ارشاد کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کو معلوم ہے کہ کون شخص واقعی ایمان رکھتا ہے اور کس شان کا ایمان رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے علم کی بنا پر اُسی قلب کو ہدایت بخشتا ہے جس میں ایمان ہو، اور اُسی شان کی ہدایت بخشتا ہے جس شان کا ایمان اس میں ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے مومن بندوں کے حالات سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ اس نے ایمان کی دعوت دے کر، اور اِس ایمان کے ساتھ دنیا کی شدید آزمائشوں میں ڈال کر انہیں اُن کے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مومن پر دنیا میں کیا کچھ گزر رہی ہے اور وہ کن حالات میں اپنے ایمان کے تقاضے کس طرح پورے کر رہا ہے۔ اس لیے اطمینان رکھو کہ جو مصیبت بھی اللہ کے اذن سے تم پر نازل ہوتی ہے، اللہ کے علم میں ضرور اس کی کوئی عظیم مصلحت ہوتی ہے اور اس کے اندر کوئی بڑی خیر پوشیدہ ہوتی ہے، کیونکہ اللہ اپنے مومن بندوں کا

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، لہٰذا ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے ۲۸۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے ۲۹۔ تمہارے

خیر خواہ ہے، بلا وجہ انہیں مصائب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔

۲۷؎ سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اچھے حالات ہوں یا بُرے حالات، ہر حال میں اللہ اور رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ لیکن اگر مصائب کے ہجوم سے گھبرا کر تم اطاعت سے مُنہ موڑ گئے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔ ہمارے رسُول پر صرف یہ ذمّہ داری تھی کہ راہِ راست تم کو ٹھیک ٹھیک بتا دے، سو اُس کا حق رسول نے ادا کر دیا ہے۔

۲۸؎ یعنی خدائی کے سارے اختیارات تنہا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی دوسرا سرے سے یہ اختیار رکھتا ہی نہیں ہے کہ تمہاری اچھی یا بُری تقدیر بنا سکے۔ اچھا وقت آسکتا ہے تو اُسی کے لائے آسکتا ہے، اور بُرا وقت ٹل سکتا ہے تو اُسی کے ٹالے ٹل سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص سچے دل سے اللہ کو خدائے واحد مانتا ہو اُس کے لیے اِس کے سوا سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا رکھے اور دنیا میں ایک مومن کی حیثیت سے اپنا فرض اِس یقین کے ساتھ انجام دیتا چلا جائے کہ خیر بہرحال اُسی راہ میں ہے جس کی طرف اللہ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اِس راہ میں کامیابی نصیب ہوگی تو اللہ ہی کی مدد اور تائید و توفیق سے ہوگی، کوئی دوسری طاقت مدد کرنے والی نہیں ہے۔ اور اِس راہ میں اگر مشکلات و مصائب اور خطرات و مہالک سے سابقہ پیش آئے گا تو اُن سے بھی وہی بچائے گا، کوئی دوسرا بچانے والا نہیں ہے۔

۲۹؎ اس آیت کے دو مفہوم ہیں۔ ایک مفہوم کے لحاظ سے اس کا اطلاق اُن بہت سی مشکلات پر ہوتا ہے جو خدا کی راہ پر چلنے میں بکثرت اہلِ ایمان مردوں کو اپنی بیویوں سے اور عورتوں کو اپنے شوہروں سے اور والدین کو اپنی اولاد سے پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد کو ایسی بیوی اور ایک عورت کو ایسا شوہر ملے جو ایمان اور راست روی میں پوری طرح رفیق و مددگار ہو، اور پھر دونوں کو اولاد بھی ایسی میسر ہو جو عقیدہ و عمل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ ورنہ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ شوہر اگر

نیک اور ایماندار رہے تو بیوی اور اولاد اُسے ایسی ملتی ہے جو اس کی دیانت و امانت اور راست بازی کو اپنے حق میں بدقسمتی سمجھتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ شوہر اور باپ اُن کی خاطر جہنم مول لے اور ان کے لیے حرام و حلال کی تمیز چھوڑ کر ہر طریقے سے عیش و طرب اور فسق و فجور کے سامان فراہم کرے۔ اور اس کے برعکس بسا اوقات ایک نیک مومن عورت کو ایسے شوہر سے سابقہ پیش آتا ہے جسے اس کی پابندی شریعت ایک آنکھ نہیں بھاتی، اور اولاد بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی گمراہی اور بدکرداری سے ماں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ پھر خصوصیت کے ساتھ جب کفر و دین کی کشمکش میں ایک انسان کے ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے دین کی خاطر نقصانات برداشت کرے، طرح طرح کے خطرات مول لے، ملک چھوڑ کر ہجرت کر جائے، یا جہاد میں جا کر اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دے، تو سب سے بڑھ کر اس کی راہ میں اس کے اہل و عیال ہی رکاوٹ بنتے ہیں۔

دوسرے مفہوم کا تعلق اُن مخصوص حالات سے ہے جو اِن آیات کے نزول کے زمانہ میں بکثرت مسلمانوں کو پیش آ رہے تھے اور آج بھی ہر اُس شخص کو پیش آتے ہیں جو کسی غیر مسلم معاشرے میں اسلام قبول کرتا ہے۔ اُس وقت مکہ معظمہ میں اور عرب کے دوسرے حصوں میں عموماً یہ صورت پیش آتی تھی کہ ایک مرد ایمان لے آیا ہے، مگر بیوی بچے نہ صرف اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ خود اُس کو اسلام سے پھیر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور ایسے ہی حالات سے اُن خواتین کو سابقہ پیش آتا تھا جو اپنے خاندان میں اکیلی اسلام قبول کرتی تھیں۔

یہ دونوں قسم کے حالات جن اہلِ ایمان کو درپیش ہوں انہیں خطاب کرتے ہوئے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

سب سے پہلے انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ دنیوی رشتے کے لحاظ سے اگرچہ یہ لوگ وہ ہیں جو انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، لیکن دین کے لحاظ سے یہ تمہارے "دشمن" ہیں۔ یہ دشمنی خواہ اِس حیثیت سے ہو کہ وہ تمہیں نیکی سے روکتے اور بدی کی طرف مائل کرتے ہوں، یا اِس حیثیت سے کہ وہ تمہیں ایمان سے روکتے اور کفر کی طرف کھینچتے ہوں، یا اس حیثیت سے کہ ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ ہوں اور تمہارے ذریعہ سے اگر کوئی بات بھی مسلمانوں کے جنگی رازوں کے متعلق ان کے علم میں آ جائے تو اسے اسلام کے دشمنوں تک پہنچا دیتے ہوں، اس سے دشمنی کی نوعیت و کیفیت میں تو فرق ہو سکتا ہے، لیکن بہر حال یہ ہے دشمنی ہی، اور اگر تمہیں ایمان عزیز ہو تو اس لحاظ سے تمہیں ان کو دشمن ہی سمجھنا چاہیے، اُن کی محبت میں گرفتار ہو کر کبھی اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ تمہارے اور ان کے درمیان ایمان و کفر

یا طاعت و معصیت کی دیوار حائل ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ ان سے ہوشیار رہو۔ یعنی ان کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ ان کی محبت کو کبھی اپنے دل میں اس حد تک نہ بڑھنے دو کہ وہ اللہ اور رسول کے ساتھ تمہارے تعلق اور اسلام کے ساتھ تمہاری وفاداری میں حائل ہو جائیں۔ ان پر کبھی اتنا اعتماد نہ کرو کہ تمہاری بے احتیاطی سے مسلمانوں کی جماعت کے اسرار انہیں معلوم ہو جائیں اور وہ دشمنوں تک پہنچیں۔ یہ وہی بات ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ "یُؤتیٰ برجلٍ یوم القیٰمة فیقال اکل عیالہ حسناتہ" "ایک شخص قیامت کے روز لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے بال بچے اس کی ساری نیکیاں کھا گئے"۔

آخر میں فرمایا گیا کہ "اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دشمنی سے تمہیں صرف اس لیے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم ان سے ہوشیار رہو اور اپنے دین کو ان سے بچانے کی فکر کرو۔ اس سے آگے بڑھ کر اس تنبیہ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بیوی بچوں کو مارنے پیٹنے لگو، یا ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، یا ان کے ساتھ تعلقات میں ایسی بدمزگی پیدا کر لو کہ تمہاری اور ان کی گھریلو زندگی عذاب بن کر رہ جائے۔ یہ اس لیے کہ ایسا کرنے کے دو نقصانات بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے بیوی بچوں کی اصلاح کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے معاشرے میں اسلام کے خلاف الٹی بدگمانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور گرد و پیش کے لوگوں کی نگاہ میں مسلمان کے اخلاق و کردار کی یہ تصویر بنتی ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی وہ خود اپنے گھر میں اپنے بال بچوں تک کے لیے سخت گیر اور بدمزاج بن جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ ابتدائے اسلام میں جب لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے تو ان کو ایک مشکل اُس وقت پیش آتی تھی جب ان کے والدین کافر ہوتے تھے اور وہ ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین سے پھر جائیں۔ اور دوسری مشکل اُس وقت پیش آتی جب ان کے بیوی بچے یا عورتوں کے معاملہ میں ان کے شوہر اور بچے، کفر پر قائم رہتے اور دینِ حق کی راہ سے انہیں پھیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی صورت کے متعلق سورۂ عنکبوت (آیت ۸) اور سورۂ لقمان (آیات ۱۴-۱۵) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ دین کے معاملہ میں والدین کی بات ہرگز نہ مانو، البتہ دنیا کے معاملات میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہو۔ دوسری صورت کا حکم یہاں

مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے[۳۰]۔ لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو[۳۱]، اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اپنے دین کو تو اپنے بال بچوں سے بچانے کی فکر ضرور کرو، مگر ان کے ساتھ سخت گیری کا برتاؤ نہ کرو، بلکہ نرمی اور عفو و درگزر سے کام لو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو التوبہ، آیات ۲۳-۲۴۔ تفہیم القرآن تفسیر سورۂ المجادلہ، حاشیہ ۳۷۔ الممتحنہ، حواشی ۱ تا ۳۔ المنافقون، حاشیہ ۱۸)۔

۳۰؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الانفال، حاشیہ ۲۳۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نگاہ میں رہنا چاہیے جسے طَبَرانی نے حضرت ابومالک اشعریؓ سے روایت کیا ہے کہ "تیرا اصل دشمن وہ نہیں ہے جسے اگر تُو قتل کر دے تو تیرے لیے کامیابی ہے اور وہ تجھے قتل کر دے تو تیرے لیے جنت ہے، بلکہ تیرا اصل دشمن، ہو سکتا ہے کہ تیرا اپنا وہ بچہ ہو جو تیری ہی صُلب سے پیدا ہوا ہے، پھر تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ مال ہے جس کا تُو مالک ہے"۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اور سورۂ انفال میں بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر تم مال اور اولاد کے فتنے سے اپنے آپ کو بچالے جاؤ اور اُن کی محبت پر اللہ کی محبت کو غالب رکھنے میں کامیاب رہو، تو تمہارے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔

۳۱؎ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ "اللہ سے ایسا ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے" (آل عمران-۱۰۲)۔ دوسری جگہ فرمایا لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا "اللہ کسی متنفس کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مُکلّف قرار نہیں دیتا" (البقرہ-۲۸۶)۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو"۔ ان تینوں آیتوں کو ملا کر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت وہ معیار ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جس تک پہنچنے کی ہر مومن کو کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری آیت یہ اصولی بات ہمیں بتاتی ہے کہ کسی شخص سے بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اللہ کے دین میں آدمی بس اُتنے ہی کا مکلّف ہے جس کی وہ مقدرت رکھتا ہو۔ اور یہ آیت ہر مومن کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی حد تک تقویٰ کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ جہاں تک بھی اس کے لیے ممکن ہو، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لانے چاہییں اور اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ اس معاملہ میں اگر وہ خود تساہل سے کام لے گا تو مواخذہ سے نہ بچ سکے گا۔ البتہ

جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۳۲۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا۳۳ اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا، اللہ بڑا قدردان اور بُردبار ہے۳۴، حاضر اور غائب، ہر چیز کو جانتا ہے، زبردست اور دانا ہے ع۲

جو چیز اُس کی مقدرت سے باہر ہو گی (اور اس کا فیصلہ اللہ ہی بہتر کر سکتا ہے کہ کیا چیز کس کی مقدرت سے واقعی باہر تھی)، اُس کے معاملہ میں اُس سے بازپرس نہ کی جائے گی۔

۳۲۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حشر، حاشیہ ۱۹۔

۳۳۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۷۔ المائدہ حاشیہ ۳۳۔ جلد پنجم الحدید، حاشیہ ۱۶۔

۳۴۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، فاطر، حواشی ۵۲-۵۹۔ الشوریٰ، حاشیہ ۴۲۔

"حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت"

ملک غلام علی صاحب

مولانا مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کے خلاف اب تک جتنی بھی تحریریں یا کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ایک دو کے ماسوا خامہ فرسائی کے ڈانڈے ہرزہ سرائی اور دشنام طرازی سے جا ملے ہیں۔ اس لیے ترجمان کے صفحات میں ان سے براہِ راست کم ہی تعرض کیا گیا ہے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی کے بعد اب ماہنامہ "البلاغ" میں مدیر البلاغ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کا ایک مضمون بالاقساط چھپنا شروع ہوا ہے۔ اس کی آمد ایک مدت سے سنی جا رہی تھی، مگر مولانا محمد تقی صاحب کے بقول انہوں نے اس مقالے کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جب کہ اس موضوع پر بحث و مناظرہ کی گرما گرمی دھیمی پڑ رہی ہے اگرچہ یہ بات کہتے وقت صاحبِ موصوف کو یاد نہیں رہا کہ عین اسی زمانے میں ایک اور بحث گرما گرمی کی حد سے بھی تجاوز کر چکی ہے، یعنی اسلام اور سوشلزم کی بحث۔ اور انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس موقع پر سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے والوں کو مجروح کرنے کی کوشش کرنا کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جس کے دل میں اسلام کا واقعی کوئی درد ہو۔ لیکن بہر حال اپنے لیے وقت کا انتخاب کرنا ان کا اپنا کام ہے۔ البتہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اُن کی تنقید کا انداز نسبتاً غنیمت اور اس لیے قابلِ اعتنا ہے۔ میں چونکہ ترجمان القرآن کے رسائل و مسائل میں اس موضوع سے متعلق چند سوالات کا جواب دے چکا ہوں اور بعض احباب نے مجھ سے اس مضمون پر بھی اظہارِ خیال کا تقاضا کیا ہے، اس لیے میں اس کے بعض ضروری پہلوؤں پر اپنا تبصرہ پیش کر رہا ہوں۔

عثمانی صاحب نے اپنے مضمون کے ابتدائی پانچ صفحات تمہیدی کلمات کی نذر کیے ہیں۔ ان سب کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن چند باتیں بہر حال لائقِ توجہ اور محتاجِ تبصرہ ہیں۔

مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ چند سال تک وہ خلافت و ملوکیت کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے۔ لیکن بعد میں فتنہ آب و تاب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اس لیے خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا"۔ کیا میں جناب محمد تقی صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ خلافت و ملوکیت کے لکھے جانے سے بہت پہلے ناصبیت اور یزیدیت کے حق میں جو منظم اور وسیع تحریری پروپیگنڈا ہمارے ملک میں منظرِ عام پر آنا شروع ہو گیا تھا، کیا ان کی نظر میں وہ بھی فتنہ کی تعریف میں آسکتا تھا یا ان کے نزدیک فتنہ بس ایک ہی تھا جس سے مقابلتاً بہر حال متقدم تھا؟ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ یہ حضرات مولانا مودودی کی خبر لینے میں تو بہت سرگرم و مستعد ہیں، لیکن اُس تحریک کے مقابلہ میں بالکل خاموش ہیں جس کے علمبردار علی الاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام میں سرے سے کوئی نظریۂ خلافت و سیاست ویسا ہی نہیں، خلافت و ملوکیت میں کوئی فرق و امتیاز ہے ہی نہیں، جو شخص جس طرح چاہے حکومت حاصل کرلے اور جس طرح چاہے اسے چلائے، اسلام سب کو سندِ جواز عطا کرتا ہے۔ ابوبکرؓ کو ایک غیر نمائندہ اجتماع میں خلیفہ بنا دیا گیا تھا، علیؓ کی خلافت سرے سے منعقد ہی نہیں ہوئی تھی، وہ خلیفہ نہ تھے بلکہ طلبِ خلافت کے لیے لڑتے رہے، حسینؓ نے "امیر المومنین یزیدؒ کے خلاف خروج کیا" اور اپنے نانا کے فرمان کے مطابق انہیں قتل ہونا ہی چاہیے تھا۔ اِن باتوں سے اسلام کے تصورِ خلافت کی جو مٹی پلید کی جا رہی تھی، اور نئی نسل کے ذہن کو اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق جن اُلجھنوں میں مبتلا کیا جا رہا تھا اس کی اصلاح کی ضرورت کسی بزرگ نے محسوس نہ کی۔ کتاب "خلافت و ملوکیت" اس ضرورت کو پورا کر رہی تھی، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ بعض حضرات اُس گمراہی کی روک تھام کرنے کے بجائے اپنا پورا زور اسی کتاب کی تردید و تغلیط پر صرف کر رہے ہیں اور اُس ناصبیت اور یزیدیت کے معاملہ میں بالکل خاموش ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے برسوں سے پھیلائی جا رہی ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب پڑھ کر جن اصحاب کو صحابہ و عدالتِ صحابہ کے دفاع کی فکر لاحق ہو جاتی ہے، عجیب بات ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت حسینؓ، اور بعض دوسرے صحابہ کرام کے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کوئی بات ان کو عدالتِ صحابہؓ کے خلاف محسوس نہیں ہوتی۔

مدیرِ "البلاغ" نے دوسرے معترضین کی پیروی کرتے ہوئے سرے سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش ہی

نہیں کی ہے کہ کتاب کا اصل موضوعِ بحث کیا ہے اور اس کو نظر انداز کرکے کتاب کی ایک ضمنی بحث کو موضوعِ تنقید بنا لیا ہے، حالانکہ اگر اس ضمنی بحث میں کوئی چیز غلط بھی ہو تو اُس کا کوئی اثر اُس مسئلے پر نہیں پڑتا جس پر خلافت و ملوکیت میں کلام کیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام میں خلافت کس چیز کا نام ہے؟ خلافت اور ملوکیت میں فرق کیا ہے؟ اسلام کا اصل نظامِ سیاست اِن دونوں میں سے کون سا تھا؟ اصل نظام میں تغیر اور خلافت سے ملوکیت کی طرف انتقال کب اور کیسے ہوا اور اس انتقال سے جو دوسرا نظام (یعنی نظامِ بادشاہی) قائم ہوا اس میں اور نظامِ خلافت میں وجوہِ امتیاز کیا تھے؟ پھر اہلِ سنت نے اس دوسرے نظام کو اگر قبول کیا تو کس معنی میں کیا؟ آیا یہ قبولیت کسی مصلحت کی بنا پر تھی یا اس بنا پر کہ یہ دونوں نظام اہلِ سنت کے نزدیک یکساں صحیح اور مقبول اسلامی نظام تھے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جس سے ہر اُس شخص کو سابقہ پیش آتا ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی نظامِ سیاست کا مطالعہ کرتا ہے۔ عربی مدارس کے ماحول میں اِس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس ماحول سے باہر کی دنیا میں، جہاں اِس وقت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے متعلق علمی اور عملی حیثیت سے نہایت دُور رس نتائج رکھنے والے فیصلے ہو رہے ہیں، اس مسئلے کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ خلافت و ملوکیت میں ساری بحث اِسی مسئلے پر کی گئی ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اُن نتائج اور دلائل و شواہد سے اختلاف ہے جو اِس کتاب کے مصنف نے پیش کیے ہیں، اور وہ فی الواقع اِس مسئلے میں اسلام کی کوئی علمی خدمت انجام دینا چاہتا ہے، تو اسے چاہیے کہ صرف نفی پر اکتفا نہ کرے بلکہ خود یہ بتائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصریح اور علمائے اہلِ سنت کی متفقہ رائے کے مطابق خلافتِ راشدہ کا دَور حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت پر کیوں ختم ہوگیا؟ اُس دَور کے بعد آنے والے نظام کو خلافت کے بجائے ملوکیت کا نظام کیوں کہا گیا؟ حضرت معاویہؓ کو صحابی و فقیہ اور مجتہد ہونے کے باوجود خلفائے راشدین میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟ خلافتِ راشدہ اور اِس ملوکیت کے نظام میں کیا فرق تھا جس کی بنا پر ایک کو خلافتِ راشدہ اور دوسرے کو ملوکیت کہا گیا؟ خلافت سے ملوکیت کی طرف یہ انتقال کیا حضرت معاویہؓ کے زمانے میں نہیں ہوا تھا؟ اگر ہوا تھا تو آخر کیسے ہوا تھا؟ اور اس معاملے میں اہلِ سنت کا ردِعمل کیا تھا؟ کیا وہ خلافت و ملوکیت دونوں کو یکساں اسلام کا نظام

مطلوب سمجھتے تھے، یا ان کے نزدیک اصل مطلوب خلافت تھی اور ملوکیت کو انہوں نے امّت کی مصلحت کی خاطر ایک ناگزیر بُرائی کے طور پر قبول کیا تھا؟ یہ ہیں وہ اصل سوالات جن سے تعرض کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ موجودہ دور کے فعّال عناصر کے ذہنوں کی اُلجھن کو دُور کیا جاسکے، اور انہیں واضح طور پر اسلام کا تصوّرِ خلافت سمجھایا جاسکے، اور وہ غلط فہمیاں رفع کی جائیں جن کی بنا پر وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ خلافت کا نظام اشخاص و افراد کی کسی غلطی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنی کسی نظریاتی داخلی کمزوری کی بنا پر نہیں چل سکا، اس لیے اس کے احیاء کا خیال ہی فضول ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ علمائے کرام میں سے کوئی صاحب بھی ان سوالات سے تعرض نہیں فرماتے اور جو صاحب بھی اُٹھتے ہیں خلافت و ملوکیت کی ایک ضمنی بحث پر لے دے شروع کر دیتے ہیں۔

مولانا عثمانی صاحب نے اِس بات کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ مناقبِ صحابہؓ یا مشاجراتِ صحابہؓ اِس کتاب کا اصل موضوعِ بحث نہیں ہے، بلکہ جن مسائل پر اس کتاب میں کلام کیا گیا ہے ان کے سلسلے میں یہ بحث ایک ناگزیر علمی ضرورت کے طور پر آئی ہے، اور جو شخص بھی اِن مسائل سے تعرض کرے گا اُسے لازماً اِس بحث سے سابقہ پیش آئے گا۔ عثمانی صاحب بڑے ناصحانہ انداز میں اس پر اِس طرح اعتراض فرماتے ہیں کہ گویا خلافت و ملوکیت کا مصنف پہلا شخص ہے جس سے مشاجراتِ صحابہ کو زبانِ قلم پر لانے کا قصور سرزد ہوا ہے حالانکہ پہلی صدی ہجری سے لے کر اِس دور تک کسی نہ کسی علمی ضرورت کی بنا پر بکثرت محدثین، شارحینِ حدیث، فقہاء، متکلمین، اور تاریخ اسلام کے مصنفین، جو سب کے سب اکابر اہلِ سنّت میں شمار کیے جاتے ہیں، ان واقعات کو بیان کرتے رہے ہیں۔ اگر یہ فعل قابلِ اعتراض ہے تو پہلی مرتبہ یہ گناہ خلافت و ملوکیت کے مصنف ہی سے نہیں ہوتا ہے۔ پھر آخر اِس گناہ کے پچھلے مرتکبین کو مواخذہ سے کیوں بری کر دیا گیا؟ عثمانی صاحب چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں ابن خلدون کو حجت مان کر بس اُس رائے پر اکتفا کیا جائے جو انہوں نے اپنے مقدمہ میں بیان کی ہے۔ لیکن اوّل تو اِس ابن خلدون نے خود اپنی تاریخ میں مشاجرات صحابہؓ کے واقعات بیان کرنے کا گناہ کیا ہے۔ معلوم نہیں عثمانی صاحب نے ان کی تاریخ بھی پڑھی ہے یا فقط مقدمہ ہی پڑھ کر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے اسلام کے تنہا ایک ہی فقیہ و محقق ابن خلدون نہ تھے، دوسرے محققین بھی ہمارے سلف میں پائے جاتے ہیں جن کی رائے ابن خلدون سے مختلف ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خلافت و ملوکیت کے مسئلے میں ابن خلدون کی

پوری بحث کو شاید عثمانی صاحب نے پڑھا اور سمجھا نہیں ہے، ورنہ وہ اسے سند قرار دینے کی جرأت نہ کرتے۔ اگر ضرورت پیش آئی تو میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ ابن خلدون کے نظریے میں کیا قباحتیں ہیں اور اسے مان لینے سے اسلام کے نظامِ سیاست میں کیا گھپلا واقع ہوتا ہے۔

توریث مسلم من الکافر کا مسئلہ مدیر البلاغ نے اپنی تنقید کا ہدف خاص طور پر خلافت و ملوکیت کے اُس حصے کو بنایا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق ہے، کیونکہ ان کے خیال میں مولانا مودودی "حضرت معاویہؓ کے بارے میں انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں جس سے اللہ لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔" مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ "امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا۔" مولانا محمد تقی صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت معاویہ پر بدعت کا الزام بالکل غلط ہے کیونکہ یہ بھی "دوسری سنت" تھی جو حضرت معاویہؓ نے جاری کی تھی، بدعت نہ تھی۔ آپ فقیہ و مجتہد تھے اور محض حضرت علیؓ سے "اختلاف" کی وجہ سے وہ شرعی مسائل میں حقِ اجتہاد سے محروم نہیں ہو سکتے۔ پھر اس مسئلے میں حضرت معاذ بن جبل اور متعدد تابعین حضرت معاویہؓ کے ہم نوا ہیں۔ اور ان کے حق میں ایک حدیث مرفوع موجود ہے کہ الاسلام یزید ولا ینقص۔

جناب محمد تقی صاحب نے امیر معاویہؓ کے اس فعل یعنی توریث مسلم من الکافر کو جس طرح اجتہاد اور سنتِ ثانیہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ متعدد پہلوؤں سے محلِ نظر ہے۔ اس میں سوال کسی صحابی یا تابعی کی ذات کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصولی مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک طرف اگر قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ موجود ہوں، سنتِ نبویہ اور سنتِ خلفائے راشدین اربعہ موجود ہو، اور دوسری طرف کسی صحابی یا تابعی کا قول یا فعل ہو جو صریحاً ان سب سے متعارض ہو تو کیا اسے بھی دوسری سنت یا اجتہاد کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ امر مسلّم ہے کہ قرآن مجید کی آیاتِ وراثت و ولایت کے مخاطب یا مکلّف کفار نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ قانونِ وراثت کا بیان ہی یُوصِیکُمُ اللہُ کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے جس کا خطاب صریحاً مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح ان آیات کے نزول کے بعد کافر و مسلم کے مابین توریث کو منقطع کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مناکحت کا تعلق ہے اس کے بارے میں قرآن مجید

ہیں صرف اہل کتاب کے معاملے میں اس حد تک استثنا کر دیا گیا ہے کہ محصناتِ اہلِ کتاب سے مسلمان مرد نکاح کر سکتا ہے اور کتابی مسلمان عورت سے نکاح نہیں کر سکتا لیکن قرآن مجید میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ کافر تو مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا مگر مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے بعد احادیثِ صحیحہ کو لیجیے۔ اگر کوئی حدیثِ صحیح اور سنّتِ ثابتہ نبویہ ایسی موجود ہوتی جو احکامِ قرآنیہ میں تخصیص یا تشریح کے ذریعے سے مسلمان کو کافر کا وارث بنا دیتی تو بلاشبہ وہ لائقِ اتباع ہوتی لیکن صحاح ستہ میں نہایت صحیح، مرفوع، متصل احادیث میں ارشادِ نبوی وارد ہے کہ لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم (نہ مسلمان کافر کا وارث ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث) - لا یتوارث اہل الملتین (دو مختلف ملتوں یعنی ملت اسلام اور ملتِ کفر کے پیرو باہم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہیں) - ان صاف اور صریح احادیث کے مقابلے میں یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلٰی (اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) - اور الاسلام یزید ولا ینقص (اسلام بڑھتا ہے گھٹتا نہیں) - یہ دونوں حدیثیں سرے سے وراثت کے مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتیں اور ان کے بالمقابل خاص وراثت ہی کے مسئلے میں نصوص کتاب و سنت قطعاً صریح الدلالت ہیں۔ اگر اسلام کے غلبہ و اضافہ کے عمومی اور اصولی بیان کو دلیل بنا کر مسلمان کو کافر کا وارث بنانا درست ہو سکتا ہے تو پھر ایک مشرکہ سے نکاح بھی درست ہو سکتا ہے اور ایک غیر مسلم کی جان و مال سے ہر طرح کا تعرض درست ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ان دو روایتوں کی سند میں بھی انقطاع ہے۔ محمد تقی صاحب نے ابنِ حجرؒ کے حوالے سے یہ تو لکھ دیا ہے کہ الاسلام یزید ولا ینقص حدیث مرفوع ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے، لیکن انہوں نے ابوداؤد باب الفرائض کھول کر اس روایت کو نہ دیکھا۔ اُس کے راوی ابوالاسود کہتے ہیں کہ: ان رجلاً حدثہ ان معاذاً قال سمعت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے یہ روایت ایک غیر معلوم الاسم اور مجہول الحال راوی نے نقل کی ہے، اس لیے حافظ ابن حجرؒ کی مراد مرفوع سے مرفوع منقطع ہے نہ کہ متصل۔ اس کے بعد حضرت معاذؓ بن جبل سے اس روایت اور اس پر مبنی مسلک کی نسبت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خود امام ابوداؤد نے اس روایت سے پہلے

لا یرث المسلم الکافر . . . . . اور لا یتوارث اھل ملتین شتی والی احادیث صحیح سند کے ساتھ درج کر دی ہیں۔ پھر ان قولی احادیث کے سوا کوئی ایک فعلی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کے مرنے پر کسی مسلمان کو اس کا وارث قرار دیا ہو یا کسی مسلمان کے اس طرح وارث بن جانے کو جائز قرار دیا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چاروں خلفائے راشدین کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ انہوں نے اسی سنتِ ثابتہ کو جاری رکھا اور اس سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ظاہر بات ہے کہ قانونِ وراثت کا تعلق بنیادی ملکی قوانین سے ہے اور عہدِ نبوی و عہدِ خلافتِ راشدہ میں سینکڑوں ایسے کفار کی موت واقع ہوئی ہوگی جن کے اعزا و اقربا مسلمان بھی ہونگے۔ مگر کیا کوئی ایک واقعہ بھی حدیث، سیرت یا تاریخ کی کسی ایک کتاب میں ایسا مل سکتا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کا وارث قرار دیا گیا ہو؟ یا حضرت معاذ بن جبل یا امیر معاویہؓ یا کسی دوسرے صحابیؓ نے وراثت کے کسی مقدمہ میں آ کر یہ شہادت دی ہو کہ آنحضورؐ کا ایسا بھی کوئی ارشاد موجود ہے جس کی بنا پر مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا کم از کم کسی مسلمان نے یہ دعویٰ ہی کیا ہو کہ اسلام چونکہ نقصان کے بجائے زیادتی کا باعث ہے اس لیے مجھے کافر مورث سے ورثہ دلایا جائے؟ خلفائے راشدین کا طریقہ تو یہ رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے خلافت سنبھالتے ہی یہ اعلان کیا کہ "انا متبع ولست بمبتدع" (میں کتاب و سنت کا متبع ہوں، مبتدع یعنی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں)۔ ان حضرات کا عام قاعدہ یہ تھا کہ اہم امور میں اگر کوئی اختلاف و اشتباہ ہوتا تھا تو صحابۂ کرام کو جمع کیا جاتا تھا، اعلان کیا جاتا تھا کہ فلاں معاملے میں اگر کسی کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ہو تو اسے آگے پیش کیا جائے۔ ایسے عام اور وقیع مسئلے میں اگر آنحضورؐ کے ایک سے زائد اقوال ہوتے تو وہ ضرور سامنے آ جاتے۔

اس سنتِ رسول اور سنت خلفائے راشدین کے بالمقابل امیر معاویہؓ کا ایک فیصلہ اور طریقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ "دوسری سنت" ہے، یا یہ ایک فقیہ یا ایک مجتہد کا قیاس و اجتہاد ہے۔ یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے آج کل ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکزِ ملت جو کچھ طے کر دے وہی سنت ہے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ طے کیا تھا

صرف وہی سنّت نہیں ہے بلکہ بعد کے ادوار کا تعامل بھی سنت ہے۔ محمد تقی صاحب نے اس ضمن میں امام زُہری کے الفاظ السُّنۃ الأولیٰ سے یہ عجیب نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو طریقہ جاری کیا وہ السنۃ الأخریٰ تھا۔ حالانکہ امام زُہری نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے آکر اس طریقے کو موقوف کیا اور پہلے طریقے کو جاری کر دیا[1]۔ ان کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ پہلے طریقہ کو چھوڑ کر جو دوسرا طریقہ حضرت معاویہؓ نے جاری کیا وہ بھی سنت ہی تھا[2]۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے خلفائے راشدین کے دَور تک مسلسل جاری رہا ہو، اور اس کے بعد کوئی شخص اسے بدل کر دوسرا طریقہ جاری کر دے تو کیا اصطلاحِ شرع میں وہ بھی "سنت" ہی ہے؟ وہ اگر سنّت ہو تو پھر آخر بدعت کس چیز کا نام ہے؟ اس طرح کی سنّتیں تو پھر اور بھی ہیں جو امیر معاویہ، مروان، یا بنو مروان نے جاری کی تھیں۔ مثلاً بیٹھ کر خطبہ دینا، خطبۂ عید کے لیے ممبر لے جانا۔ اور نماز عیدین سے پہلے خطبہ پڑھنا[2]۔ کیا یہ سب اجتہادات ایک سنت ہی بنا رہے ہیں؟ اگر یہ ساری کارروائیاں "سنّت، یا مدیر البلاغ کے خیال کے مطابق" دوسری سنّت" کی تعریف میں آتی ہیں، تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ خلفائے بنو امیہ ہی کے ایک فرد حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے ان کا خاتمہ ضروری سمجھا؟ اور اہلِ سنت کے کسی مسلک و مذہب نے آج تک ان کے مطابق عمل نہ کیا؟

علامہ بدر الدینؒ عینی اور حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسروق، محمد بن حنفیہ، محمد بن علی بن حسین، سعید بن مسیّب، ابراہیم نخعی، اسحٰق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ ہم کفار

---

[1] یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مودودی نے البدایہ کے جو دو حوالے دیتے ہیں ان میں ایک جگہ السنۃ الأولیٰ کے الفاظ ہیں اور دوسری جگہ جلد ۸ ص ۱۳۹ پر فقط السنۃ کا لفظ ہے، یعنی حضرت عمر بن عبد العزیز نے سنت کو قائم کر دیا۔

[2] شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں عن طاؤس قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائماً وابوبکر وعثمان وان اول من جلس علی المنبر معاویۃ بن ابی سفیان (ازالۃ الخفا جلد دوم ص ۲۹۹ ناشر نور محمد کراچی)۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابابکر وعمر وعثمان کانوا یبتدؤن بالصلوٰۃ قبل الخطبۃ حتی قدم معاویۃ فقدم الخطبۃ (کتاب الام جلد اول صفحہ ۲۰۸ مطبع امیریہ مصر ۱۳۲۲ھ)۔ اسی طرح مروان کا نماز عید سے پہلے خطبہ پڑھنا صحاح ستہ کی متعدد احادیث میں مروی ہے اور بیٹھ کر خطبہ دینا بھی روایات میں مذکور ہے۔

کے یا اہل کتاب کے وارث ہوں کیونکہ یہ قیاس کا تقاضا ہے۔ لیکن امر واقعی اور صحیح بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کی طرف اس قول کی نسبت کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہے، اور ثابت ہو بھی تو نصوصِ کتاب و سنت کے مقابلے میں سرے سے کسی قیاس یا اجتہاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا محمد تقی صاحب نے ابن حجرؒ کی بحث سے اپنے مطلب کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور بقیہ کو حذف کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

وحجة الجمهور انه قياس في معارضة النص وهو صريح في المراد ولا قياس مع وجوده. اما الحديث فليس نص في المراد بل هو محمول انه يفضل غيره من الاديان ولا تعلق له بالارث وقد عارضه قياس آخر وهو ان التوارث يتعلق بالولاية ولا ولاية بين المسلم والكافر لقوله تعالى لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء بعضهم اولياء بعض۔

اور جمہورؒ کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث بنانا ایک ایسا قیاس ہے جو نص کے خلاف پڑتا ہے اور جب کسی مسئلے میں ایک نص موجود ہو جو اسی خاص مسئلے کے متعلق صریح حکم دے رہی ہو تو اس کی موجودگی میں قیاس کا کوئی موقع نہیں۔ رہی وہ حدیث جو اِس قیاس کے حق میں پیش کی گئی ہے (یعنی الاسلام یزید ولا ینقص) تو اس کا وراثت کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب بس یہ ہے کہ اسلام دوسرے ادیان پر فضیلت رکھتا ہے اور یہ وراثت کے مسئلے میں کوئی نص نہیں ہے۔ پھر یہ قیاس ایک دوسرے قیاس سے بھی ٹکراتا ہے اور وہ اس طرح کہ توارث کا تعلق ولایت سے ہے اور مسلم اور کافر کے درمیان کوئی ولایت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی۔ وہ ایک دوسرے کے ولی (دوست اور خیر خواہ) ہیں۔

ابن حجرؒ کی عبارت کا ایک حصہ البلاغ میں نقل کر کے اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اِس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہلِ کتاب کے وارث ہوں اور وہ نہ ہوں، جیسے ہمارے لیے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے لیکن ان کے لیے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ یہ عبداللہ بن معقل کا قول ہے جس کا رد آگے

خود ابن حجرؒ نے کر دیا ہے۔ مگر البلاغ میں اسے نقل نہیں کیا گیا۔ ابن حجر فرماتے ہیں:

فان الدلیل ینقلب فیما لو قال الذمی ارث المسلم لانه یتزوج الینا۔

یہ دلیل تو اُلٹ کر ہمارے خلاف بھی پڑ سکتی ہے۔ ایک ذمّی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں بھی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہوں کیونکہ مسلمان ہماری عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔

اس مسئلے میں مولانا مودودی کے بعض ناقدین المُغنی لابن قُدامہ کے بھی نامکمل حوالے دیتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کتاب کا وہ اقتباس بھی دے دیا جائے جو بحث کے آخر میں حاصلِ کلام کے طور پر درج ہے۔ المُغنی، ج ۶، ص ۲۹۶ پر ابن قُدامہ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد بن الحنفیہ، علی بن حسین، سعید بن المسیب، مسروق، عبداللہ بن مغفل، شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ولیس بموثوق بہ عنہم (اور اس کی نسبت اُن کی جانب قابلِ اعتماد نہیں ہے)۔ تقریباً یہی وہ نام ہیں جنہیں "البلاغ" میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ پھر ابن قُدامہ فرماتے ہیں:

لا یرث الکافر المسلم ولا المسلم الکافر متفق علیہ۔ وروی ابوداؤد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یتوارث اھل الملتین شتی۔ ولان الولایۃ منقطعۃ بین المسلم والکافر فلم یرثہ کما لا یرث الکافر المسلم۔

"کافر مسلم کا وارث نہیں، نہ مسلم کافر کا"۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دو مختلف ملتوں کے پیرو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے"۔ مزید یہ کہ مسلم اور کافر کے مابین ولایت کا تعلق منقطع ہے اس لیے جس طرح کافر مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا اسی طرح مسلم کافر کا وارث بھی نہیں ہو سکتا۔

<u>دیت کا مسئلہ</u> اس کے بعد ہم دیت کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے "حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہو گی، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی"۔ عثمانی صاحب اس پر فرماتے ہیں: اوّل تو خط کشیدہ جملہ (یعنی اقتباس بالا کا پہلا جملہ) نہ حافظ ابن کثیر کا ہے، نہ امام زہری کا۔ بلکہ یہ خود مولانا

کا ہے ۔ یہ نشاندہی ہم نے اس لیے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جُملہ حافظ ابن کثیر کا ہے ۔ البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے : وبہ قال الزھری ومضت السنّۃ ان دیۃ المعاھد کدیۃ المسلم وکان معاویۃ اوّل من قصرھا الی النصف واخذ النصف لنفسہ

مذکورہ سند ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ : سنت یہ چلی آرہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی اور حضرت معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا اور نصف اپنے واسطے لے لی:"

مدیر" البلاغ" نے ابن کثیر کے قول کے ساتھ سابق فقرے کے آخری الفاظ وبہ قال الزھری کو غلط طریق پر ملا کر ابن کثیر کے قول کو امام زہریؒ کا قول بنا دیا ہے ۔ حالانکہ قال اور بہ قال یا قال بہ کے معانی کا فرق تو انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا اور اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہونا چاہیے تھا کہ بہ قال کے الفاظ کو بالعموم آخر میں لایا جاتا ہے اور اس کا اشارہ قول ماسبق کی جانب ہوتا ہے ۔ بہر کیف نفس مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ قائل خواہ ابن کثیر ہوں یا امام زہری، قول یہی بیان ہوا ہے کہ پہلے سے یہ سنت چلی آرہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہو، لیکن امیر معاویہؓ نے اسے نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی ۔

توریث مسلم من الکافر والے معاملے کی طرح یہاں بھی مدیر موصوف یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کا یہ فعل سنت میں تبدیلی نہیں، بلکہ سنت ہی کی ایک صورت ہے ۔ انہوں نے اپنے حق میں استدلال کرتے ہوئے پہلی بات جو کہی ہے وہ یہ ہے کہ اخذ النصف لنفسہ کے بالمقابل سُنن بیہقی میں امام زُہری کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ القی النصف فی بیت المال ۔ اس لیے لنفسہ سے مراد بھی بیت المال کے لیے دیت لینا ہے، نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے ۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا سادہ اور اس کی توجیہ اتنی آسان نہیں جیسا کہ عثمانی صاحب یا بعض دوسرے حضرات نے سمجھا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مورخین نے دوسرے مقامات پر بھی امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لیے دونوں طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ ایک ہی واقعہ میں کہیں لنفسہ کا لفظ ہے اور کہیں لبیت المال کا لفظ ۔ اب اگر بیت المال کی

پوزیشن فی الواقع امیر معاویہ اور آپ کے جانشینوں کے زمانے میں وہی ہوتی جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں تھی، تب تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہر جگہ لنفسہ سے مراد لبیت مال المسلمین ہے۔ لیکن بیت المال اگر ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لیے بلا تامل اور بے دریغ استعمال ہونے لگے، فرمانروا کے صرفِ خاص اور قوم کے بیت المال میں عملاً کوئی فرق نہ رہے، اور مسلمانوں کا امیر بیت المال کے آمد و خرچ اور حساب کتاب کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جواب دہ نہ رہے، تو پھر صورتِ حال اُلٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں اخذ لبیت المال بھی اخذ لنفسہ بن کر رہ جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تو بہت بالا و برتر ہے کہ آپ لا اسئلکم علیہ اجرا اور لا نرث ولا نُورَثُ کے منصب پر فائز تھے۔ لیکن آپ کے خلفائے راشدین کے بارے میں بھی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ماسوا جنہوں نے بیت المال سے کوئی معاوضہ ہی نہیں لیا، دوسرے خلفاء کے معمولی مشاہرے مقرر تھے جن پر وہ بعسرت زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے ذاتی مصارف پر بیت المال کا ایک حبہ بھی خرچ نہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے پاس وفات کے وقت صرف سات سو درہم تھے۔ اور شیخینؓ نے تو اپنی تنخواہ بھی بیت المال میں لوٹا دینے کی وصیت فرمائی تھی۔ پھر ان کے زمانے میں ہر مسلمان کو بیت المال کے آمد و صرف پر محاسبہ کرنے کا حق تھا۔ امیر معاویہؓ کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں، وہ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ بننے سے پہلے ہی حضرت علیؓ کے بالمقابل وہ شامی بیت المال پر علی الاطلاق قابض و متصرف تھے؟ حالانکہ اُس کی حیثیت مرکزی بیت المال کی ایک شاخ کی تھی۔ پھر کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ ان کے عہدِ خلافت میں خلیفہ کے لیے ایک مشاہرہ متعین کر دیا گیا ہو اور بیت المال کے مصارف ان کے ذاتی مصارف سے بالکل الگ رکھے گئے ہوں؟ اور کیا ان کے زمانے میں بھی کوئی مسلمان بیت المال کا حساب ان سے مانگ سکتا تھا؟ اس کے بعد جو حضرات لبیت المال کے الفاظ کو لنفسہ کے الفاظ سے مختلف معنی پر محمول کرتے ہیں ان کے استدلال میں کوئی زور باقی نہیں رہتا۔

مدیرہ "البلاغ" کے استدلال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاہد کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لیے یہ مسئلہ عہد صحابہ سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے کہ معاہد کی دیت

مُسلم کی دیت کے برابر ہو یا کم ہو۔ امیر معاویہؓ نے اپنے فقہی اجتہاد کی بنا پر متعارض احادیث و آثار میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدھی دیت آپ نے ذمّی کے وارثوں کو دلوائی اور آدھی بیت المال میں داخل کردی۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، امیر معاویہ کا یہ اجتہاد فی نفسہٖ نصوصِ کتاب و سنّت کے خلاف ہے اور اس سے احادیثِ مختلفہ میں توفیق و تطبیق کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے قرآن مجید سے رجوع کیا جائے تو وہاں سورۂ نساء، آیت ۹۲ میں مومن اور کافرِ معاہد، دونوں کے قتل خطا کے معاملہ میں دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ کے الفاظ وارد ہوتے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی مماثلت اور مساواتِ دیت کی روایات (مثلاً دیۃ ذمی دیۃ مسلم، تتکافاء دماؤھم وغیرہ) صحابہ و تابعین اور فقہاء مجتہدین کے اسی مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ دونوں دیتیں برابر ہیں، اور امام سرخسیؒ کے قول کے مطابق اس کے خلاف آثار پایہ صحت کو نہیں پہنچتے[1]۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کہ اس مسلک کے خلاف بھی روایات و آثار موجود ہیں۔ اس لیے بعض مذاہبِ فقہیہ نے کافرِ معاہد کی دیت کو مسلم کی دیت کا نصف یا ایک تہائی قرار دیا ہے اور ان مذاہب میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن

قرآن مجید میں مسلم اور معاہد دونوں کی دیت کے متعلق مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کی دیت ہو یا کافرِ معاہد کی، بہر حال وہ پوری کی پوری مقتول کے اہلِ خاندان کے حوالے کردی جائے۔ قرآن کا ارشاد اس معاملے میں بالکل ناطق اور صریح ہے جس میں اس تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کہ دیتِ مقررہ کا کوئی حصّہ مقتول کے وارثوں کے بجائے کسی دوسرے کے پاس جائے۔ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ کے الفاظ میں الی امیر المومنین یا الی بیت المال کا مفہوم آخر کس طرح داخل ہوسکتا ہے؟ اور اگر کسی تاویل یا کسی مصلحت کی رُو سے معاہد کی دیت کا کوئی حصّہ مسلمانوں کے بیت المال میں جا سکتا ہے، تو پھر مسلمان کی دیت کا کوئی حصہ کیوں نہیں جا سکتا؟

روایات و آثار میں دیتوں کے تناسب و مقادیر میں تو اختلاف ضرور رہا ہے لیکن کوئی "گری پڑی" روایت

---

[1] ولما انفرد انبہ من الآثار بخلاف ھذا لا یکاد یصح۔ فقد روی عن معمر رضی اللہ عنہ قال سألتُ الزھری عن دیۃ الذمی، فقال مثل دیۃ المسلم۔ فقلت ان سعیداً یروی بخلاف ذلک۔ فقال ارجع الی قولہ تعالیٰ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ۔ المبسوط جلد ۲۶ ص ۸۵۔

بھی مجھے نہیں مل سکی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ذمّی یا معاہد کی دیت، خواہ وہ دیتِ مُسلم کے مساوی ہو یا ½ یا ⅓،
اس کا کوئی حصہ بیت المال میں بھی جا سکتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں اور ان کے بیت المال کا خیرخواہ اللہ اور
اس کے رسُول سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ مسلم و غیرمسلم کے جو حقوق و واجبات جس شکل میں کتاب و
سنت نے متعین کر دیئے ہیں، ان میں نہ کمی جائز ہے نہ زیادتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ جو
ذمیوں کے حقوق پر دست درازی کرے میں اس کے خلاف قیامت کے روز خود مدعی ہوں گا (انا خصمہم یوم
القیامۃ)۔ یہی وجہ ہے کہ روایات کے اختلاف کی بنا پر بعض فقہی مذاہب میں مُعاہد کی دیت مسلمان کے مقابلے
میں کم تو بیان کی گئی ہے لیکن سب کا منشا یہی ہے کہ جو دیت بھی ہو وہ پُوری کی پُوری مقتول کے وارثوں کے
حوالے کی جائے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔ نہ یہ کہ مسلمان کی دیت تو اس کے اہلِ خاندان کو پُوری دی جائے
اور کافر معاہد کی دیت کا آدھا یا دو تہائی بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ نے درحقیقت
نہ اِس مسلک پر عمل کیا کہ ذمّی کی دیت مسلمان کے برابر ہے، اور نہ اِس پر کہ اُس کی دیت مسلمان سے آدھی ہے۔
بلکہ انہوں نے کیا یہ کہ اُس کی دیت تو رکھی مسلمان کے برابر ہی، مگر آدھی اس کے وارثوں کو دی اور آدھی خزانے
میں داخل کر دی۔ یہی فعل بدعت تھا کیونکہ اس کے لیے کوئی برائے نام دلیل بھی قرآن و سنت میں نہیں ہے۔
امام زُہری کی دوسری روایت جو "البلاغ" نے ابن کثیر والی روایت کے مقابلے میں سُنن بیہقی سے نقل کی ہے"
اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دیت کا وہ حصّہ جو امیر معاویہؓ نے بیت المال کے
لیے مقرر کیا تھا، ساقط کر دیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ توریث مسلم من الکافر کے معاملے میں تو خیر ایک صحابی اور چند تابعین کی جانب امیر
معاویہ کی ہمنوائی منسوب کی گئی ہے، گو وہ غیر موثق ہی سہی، لیکن اِس دوسرے اجتہاد میں تو غالباً امیر معاویہؓ
بالکل ہی تنہا ہیں کہ ذمّی کی دیت مقرر ہو جانے کے بعد، اس کا کوئی حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے۔ مجھے
باوجود کوشش و تلاش کے کوئی روایت، اثر یا فقہی جزئیہ ایسا نہیں مل سکا جس سے یہ ثابت ہو کہ معاہدِ مقتول
کی دیت کی کوئی مقدار ایسی بھی ہے جو بیت المال میں داخل کی جانی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد
مبارک سے لے کر خلفائے راشدین کے پُورے دور تک اس امر کی کوئی مثال بھی نہ پائی گئی کہ کبھی کسی معاہد

کہ دیت کا کوئی حصہ بیت المال میں داخل کیا گیا ہو۔ دیتوں کا اختلاف و عدمِ مساوات اور چیز ہے اور ان میں سے کسی جزو کا بیت المال میں جانا اور چیز۔ اس دوسری چیز کا ثبوت اگر امیر معاویہؓ کے سوا کسی اور سے ملتا ہو تو اسے پیش کیا جانا چاہیے۔

عثمانی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے عمل کی مصلحت ان کی اپنی زبانی یہ پیش کی ہے کہ اگر ذمّی کے قتل سے اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس کی مزید تشریح عثمانی صاحب نے یہ کی ہے کہ جو جزیہ وہ ادا کرتا تھا وہ بند ہو گیا، اس لیے دیت کا آدھا حصہ (پانچ سو دینار) مقتول کے رشتہ داروں کو دو اور اتنا ہی بیت المال میں لو۔ اس انوکھے استدلال سے اگر کوئی شخص مطمئن ہو جائے تو میں اسے مدیر البلاغ کی کرامت ہی شمار کروں گا۔ سوال یہ ہے کہ ذمّی کے قتل سے اگر بیت المال کا نقصان ہوتا ہے تو مسلمان کے قتل سے بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ بھی تو زکوٰۃ، عُشر، صدقات دیتا ہے۔ تو پھر مسلمان کی دیت کا ایک حصہ بھی کیوں نہ اس کے وارثوں کے بجائے بیت المال کو جائے؟ بلکہ قتل کیا معنیٰ، جو ذمّی یا مسلمان طبعی موت مرتا ہے یا کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے، اس سے بھی تو بیت المال کا نقصان ہوتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہر مرنے والے کے ترکے پر، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، موت کا ایک محصول (DEATH DUTY) عائد کر دیا جائے جو وراثت کی تقسیم سے پہلے بیت المال کے لیے وصول کر لیا جائے؟ مغربی ممالک میں تو اس کا عام چلن ہے۔

حیرت ہے کہ مدیر البلاغ پھر بھی فرماتے ہیں کہ ایسے حسین استدلال و اجتہاد کی تعریف نہ کرنا کتنا بڑا ظلم ہے۔ کیا میں ان سے دریافت کر سکتا ہوں کہ اگر اجتہاد و فقاہت میں حضرت معاویہؓ کا یہی مقام تھا، اور وہ خود ایک نئی "سنّت" جاری کرنے تک کے مجاز تھے، اور سنّتِ نبویہ اور سنّتِ خلفائے راشدین سے ہٹ کر ایک کام کر کے بھی وہ قابلِ تحسین ہی تھے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ علمائے اہلِ سنّت نے انہیں پانچواں خلیفۂ راشد تسلیم نہیں کیا؟ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ علمائے اہلِ سنت آج تک کسی تعصب میں مبتلا رہے ہیں۔ اس ظلم کی تلافی اب آپ حضرات فرمائیں اور کھل کر ان کی خلافتِ راشدہ کا اعلان کر دیں۔ (باقی)

سوڈان کے رہنماؤں کو ایک مخلصانہ مشورہ

ابوالاعلیٰ مودودی

[سوڈان میں اسلامی دستور کی تاریخ انہی مراحل سے گزر رہی ہے جن سے یہ پاکستان میں گزری ہے۔ ۱۹۵۶ء میں سوڈان کی آزادی کے ساتھ ہی اسلامی دستور کا مطالبہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر طاقت پکڑ گیا کہ صاف نظر آنے لگا کہ یہ ملک آزادی کے دور میں داخل ہوتے ہی اسلامی نظام سے متمتع ہونے والا ہے۔ مگر مصر کی دراندازیوں نے بنے ہوئے کھیل کو بگاڑ کر رکھ دیا اور آخر کار سوڈانی فوج کے ایک عنصر نے ابراہیم عبود کی قیادت میں فوجی انقلاب برپا کر دیا جس کے نتیجے میں یہ ملک کئی سال تک دستور اور قانون کی حکومت سے محروم رہا۔ پھر سوڈانی عوام کی حریت پسندی اور ہمتِ مردانہ نے فوجی آمریت کو بزور بازو رخصت کر دیا اور ملک ازسرِنو جمہوری فضا میں داخل ہو گیا۔ جمہوریت کی بحالی کے بعد پچھلے دو سال سے دستوری کشمکش پھر چھڑ چکی ہے۔ چند ماہ پیشتر کی بات ہے کہ دستور سازی کا کام آخری مرحلے میں تھا، مگر سوشلسٹوں اور ملحد عناصر نے ملی بھگت کر کے یکایک بحران پیدا کر دیا اور قبل اس کے کہ دستور کی تیسری خواندگی مکمل ہوتی مجلس دستور ساز کی مدت ختم ہو گئی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ اب دوبارہ انتخاب کے بعد نئے سرے سے دستور سازی کا آغاز ہوا ہے۔ اس سلسلے کا حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ سوڈان کی اکثریتی پارٹی حزب الامہ، جو دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی اور جس کی باہمی پھوٹ سے سوشلسٹ، کمیونسٹ اور لادین عناصر فائدہ اٹھا کر ملک کے اندر انارکی پھیلا رہے تھے، اب پھر متحد ہو چکی ہے، اور اس کے دونوں گروپ، جن میں سے ایک کا قائد امام ہادی المہدی ہے اور دوسرے کی زمامِ قیادت صادق المہدی کے ہاتھ میں ہے، اس بات

پر متفق ہو چکے ہیں کہ سوڈان کا دستور اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو۔ اسماعیل اَزہری کی یونینسٹ ڈیموکریٹک پارٹی (حزبِ الاتحاد الدیمقراطی) کے حامیوں کی بھاری تعداد بھی اسلام کے حق میں ہے یہ صورتِ حال ملاحدہ اور کمیونسٹوں کے لیے شدید پریشانی کی موجب بنی ہوئی ہے۔ عرب اخبارات کی اطلاعات کے مطابق اب کمیونسٹوں نے جنوبی سوڈان کے عیسائیوں اور لامذہب (PAGAN) قبائل کو اپنے تعاون کی پیش کش کی ہے تاکہ اسلامی دستور کا راستہ بند کیا جا سکے۔ یہ لوگ جو اسلام کا راستہ روکنے کے لیے عیسائیوں اور لامذہبوں تک سے ملنے کے لیے تیار ہیں کہیں باہر سے نہیں آ گئے ہیں بلکہ مسلمان قوم ہی کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی جماعت کے جنرل سکرٹری کا نام عبدالخالق محجوب ہے اور ان کی مزدور یونین کے جنرل سکرٹری الحاج عبدالرحمٰن ہیں۔ عرب اخبارات کی اطلاع کے مطابق جنوبی سوڈان کے عیسائیوں نے تو ان کمیونسٹوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے البتہ صرف لامذہب قبائل ہیں جو ان کی تائید کر رہے ہیں۔ اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ شاید سوڈان میں اسلامی دستور اور اسلامی نظام نافذ ہو جاتے گا۔ لیکن اس سلسلے میں افسوس کی بات یہ ہے کہ سوڈان کے بعض مسلم عناصر خود احساس کہتری کے شکار ہو گئے ہیں اور وہ ریاست کے نام کو خالص اسلامی شکل دینے میں جھجک محسوس کر رہے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی نے سوڈان کے موجودہ صدر جناب اسماعیل ازہری، اُمہ پارٹی کے رہنما جناب ہادی المہدی، سلسلۂ میرغنیہ کے سربراہ محمد عثمان میرغنی اور بعض دوسرے بڑے بڑے رہنماؤں کو اپنے ایک خط میں اِس غلطی سے اجتناب کی نصیحت کی ہے۔ مولانا محترم کا یہ خط درجِ ذیل ہے۔ اور قارئین کی معلومات کے لیے اسے ترجمان کے صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

[خ ۔ ح]

سوڈان ہماری نگاہ میں وطن اسلامی کا ایک بہت اہم رکن ہے۔ اور دنیا میں جس مسلمان کو بھی اسلام سے واقعی محبت ہے وہ سوڈان کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور ماضی قریب میں سوڈانی مسلمانوں کی شاندار دینی تحریک کا قدرداں ہے۔ اسی وجہ سے میں چند کلمات خیرخواہی کے جذبہ سے آپ کو لکھ رہا ہوں اور مجھے

امید ہے کہ جس جذبے سے میں لکھ رہا ہوں آپ اس کی قدر کریں گے ۔

استعمار کے چنگل سے جو مسلمان ملک بھی آزاد ہو اُس کی آزادی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں اگر وہ پھر اُسی اسلام کی طرف نہ پلٹے جس سے استعمار نے اُس کو پھیرنے اور محروم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہم اُس کے چنگل سے آزاد ہو کر بھی اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی نظامِ زندگی کو از سرِ نو قائم نہ کریں اور اپنے دائرۂ اختیار میں اسلام کے دستور و قانون کو نافذ نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے صرف اُس غلامی کی زنجیریں توڑی ہیں جس سے باہر والوں نے ہمارے جسم کو کسا تھا، لیکن ہماری رُوح ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہے۔ اِسی خیال سے ہم پچھلے بیس بائیس سال سے اپنے ملک، پاکستان میں اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، اور اِسی مقصد کے لیے ہم دنیا کے دوسرے آزاد مسلم ممالک کے لوگوں کو بھی اِس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ وہ اپنے ہاں اسلامی دستور نافذ کریں۔ سوڈان میں بھی خدا کے فضل سے یہ تحریک موجود ہے، اور وہاں کے مسلمانوں کی عام خواہش یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر جب کہ آپ کے ہاں دستور سازی کا کام ہو رہا ہے ہماری دلی تمنا ہے کہ آپ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ملک کی ایک چھوٹی سی اقلیت کیا چاہتی ہے، اپنے دین کے تقاضوں اور اُمّتِ مُسلمہ کی عظیم اکثریت کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے وہاں اسلامی دستور نافذ کریں۔

پاکستان میں جو لوگ سوڈان سے محبت رکھتے ہیں اُن کو یہ سُن کر دلی صدمہ ہوا ہے کہ آپ کے ہاں ریاست کا نام "جمہوریۂ سوڈان" (THE REPUBLIC OF SUDAN) تجویز کیا جا رہا ہے اور اُس کی تشریح میں یہ لکھا جا رہا ہے کہ "سوڈان ایک جمہوری اشتراکی ریاست ہے جو اسلامی ہدایت پر مبنی ہے"۔

(SUDAN IS A DEMOCRATIC SOCIALIST REPUBLIC BASED ON ISLAMIC GUIDANCE)

یہ چیز اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ سوڈان اپنا تعارف دنیا کے سامنے ایک ایسی مملکت کی حیثیت سے کرانا چاہتا ہے جو نہ پوری مسلمان ہے اور نہ پوری غیر مسلم۔ ایک لفظ سے وہ مسلمانوں کو مطمئن کرنا چاہتا ہے اور دوسرے لفظ سے غیر مسلموں کو۔ حالانکہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ: ۱۲۰) "یہود اور نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی ملت

کے پیرو نہ ہو جاؤ)۔ آپ اس چیز سے غیر مسلموں کو تو راضی کر نہیں سکیں گے البتہ مسلمانوں کو غیر مطمئن کر دیں گے۔ اس نام اور اس تشریح کو اگر ایک فرد پر چسپاں کیا جائے تو بات گویا یہ ہو گی کہ ایک شخص اٹھ کر اپنا تعارف یہ کراتا ہے کہ "میں ایک انسان ہوں جو جمہوریت اور سوشلزم پر ایمان رکھتا ہے اور اسلام کی ہدایت پر چلنا چاہتا ہے"۔ کوئی تعلیم یافتہ آدمی جو جمہوریت، سوشلزم اور اسلام کو جانتا ہو وہ اُس کی اس بات کو سن کر یہ رائے قائم کرے گا کہ اس شخص کا واقعی کوئی مسلک نہیں ہے، یا یہ مختلف مسلکوں کو بے سوچے سمجھے جمع کر رہا ہے، یا ہر ایک کو راضی کرنے کے لیے اُس کے مطلب کی بات کر رہا ہے۔

اس تنقید پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن سچی بات کہنا ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لیے میں آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ اپنی جمہوریہ کا نام اسلامی جمہوریہ سوڈان رکھیں، اور اس کی تشریح میں یہ لکھیں کہ "سوڈان ایک ایسی جمہوری مملکت ہے جو جمہوریت اور عدالتِ اجتماعی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہے" SUDAN IS A REPUBLIC BASED ON ISLAMIC PRINCIPLES OF DEMOCRACY AND SOCIAL JUSTICE - اس سے دنیا یہ بھی سمجھ جائے گی کہ آپ مسلم قوم ہیں اور آپ کی حکومت اسلام کے نظام پر قائم ہے، اور یہ بھی سمجھ جائے گی کہ آپ کا نظام آمریت پر نہیں بلکہ جمہوری طریقے پر قائم ہوگا اور یہ بھی اسے معلوم ہو جائیگا کہ آپ اپنے ہاں وہ عدلِ اجتماعی قائم کریں گے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ سوشلزم ایک دھوکا دینے والا لفظ ہے جسے استعمال کر کے آپ اپنے متعلق یہ شبہات پیدا کر دینگے کہ آپ اس نظام کی طرف میلان رکھتے ہیں جو دنیا میں اس نام سے معروف ہے اور جس پر دنیا کی بہت سی ریاستیں اس وقت چل رہی ہیں۔ پھر سوشلزم اور جمہوریت دو ایسی چیزیں ہیں جو الفاظ میں تو جمع ہو سکتی ہیں مگر عمل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ جو سوشلسٹ ہیں وہ آپ کی اس بات سے غیر مطمئن ہوں گے کہ آپ اسلام کی رہنمائی پر چلنا چاہتے ہیں، اور جو مسلمان ہیں وہ آپ کی اس بات پر غیر مطمئن ہونگے کہ آپ کی جمہوریہ ایک سوشلسٹ مملکت ہوگی۔ انتخابات کے موقع پر آپ کے خود اپنے رائے دہندگان یہ فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ آیا انہیں ایک اسلامی نظام چلانے والوں کو منتخب کرنا ہے یا ایک سوشلسٹ نظام چلانے والوں کو۔ اس سے ان کے اندر ایک ذہنی پراگندگی پیدا ہو جائے گی اور وہ ایسے دو رنگے لوگوں کو منتخب کرینگے جو نہ سیدھی طرح اسلامی نظام چلا سکیں گے اور نہ سوشلسٹ نظام۔

(یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ سوڈان سے فوجی انقلاب کی اطلاع آگئی)

ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۵)

جامع ایوبؓ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک ایک وسیع اور کشادہ عمارت کے اندر ہے۔ کاشی کے کام نے عمارت کو حسنِ باطن کے ساتھ ساتھ حسنِ ظاہر کا پیکر بھی بنا دیا ہے۔ مزار شریف کے ساتھ ہی مسجد ہے جسے جامع ایوبؓ کہتے ہیں۔ اور یہ اُن چند مساجد میں سے ایک ہے جو خلفائے آلِ عثمان کی اسلام سے وابستگی کی لازوال یادگاریں سمجھی جاتی ہیں۔ ترکی زبان میں مسجد کا لفظ بہت کم سننے میں آتا ہے۔ جسے ہم مسجد کہتے ہیں ترک اُسے جامع کہتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابو ایوبؓ اُس لشکر میں شریک تھے جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے روانہ کیا تھا۔ محاصرہ کے دوران حضرت ابو ایوبؓ کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے انہوں نے یہ وصیت فرمادی تھی کہ میری میت کو قسطنطنیہ کی دیواروں سے جس قدر قریب لے جاکر دفن کیا جا سکے دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ آپؓ کی وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل آپ کو دفن کر دیا گیا اور جب اسلامی فوج نے محاصرہ اٹھایا تو اعلان کر دیا گیا کہ اگر اس قبر کو کوئی گزند پہنچا تو شام یا اسلامی دنیا میں کسی مسیحی عمارت کو محفوظ نہ چھوڑا جائے گا۔ سلطان محمد فاتح نے جب ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو فتح کے تیسرے روز ایک بزرگ نے حضرت ابو ایوبؓ کے مرقد مبارک کا سراغ لگایا اور وہاں آپ کا مقبرہ اور مسجد تعمیر کی گئی۔ اس جلیل القدر صحابی کی قبر کے انکشاف سے فاتح عثمانی لشکر کے اندر مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق ہر لشکری اس احساس میں ڈوب گیا کہ اس فتح کے

اصل فائدہ وہ مقدس صحابی ہیں جو آٹھ سو سال سے فصیلِ قسطنطنیہ کے پاس اس اسلامی لشکر کا انتظار کر رہے ہیں جو اس فصیل کو عبور کرے گا۔

سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان اوّل (۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۶ء) کی جو تلوار آلِ عثمان کے پاس نسلاً بعد نسل چلی آرہی تھی، محمد الفاتح نے وہ تلوار جامع ایوبؓ میں رکھوا دی۔ محمد الفاتح کے بعد جو سلطان بھی سریر آرائے سلطنت ہوتا وہ جامع ایوبؓ میں حاضری دیتا اور اس تلوار کو حمائل کرتا۔ دنیا پرست سلاطین تاجپوشی کے وقت جو پُرمسرت تقریبیں منعقد کرتے ہیں اور جس جاہ و جلال کی نمائش کرتے ہیں، عثمانی سلاطین ان کے برعکس اس روایت کے پابند رہے ہیں کہ تخت نشینی کے وقت سلطان باوضو ہوکر مسجدِ ایوبؓ میں حاضر ہوتا، دو رکعت نماز ادا کرتا اور مسجد کے امام صاحب کے ہاتھ سے سیفِ عثمانی لے کر گلے میں حمائل کرتا۔ اسی طرح جب کوئی لشکر جہاد کے لیے نکلتا تو سالارِ لشکر اس موقع پر بھی امام کے ہاتھ سے اس تلوار کو لیتا اور یہ عہد کرتا کہ "تلوار اسلام کی محافظ رہے گی اور اسلام تلوار کا محافظ رہے گا"۔ اس کے بعد تکبیر و تہلیل کے نعروں کے ساتھ وہ اپنی سپاہ کو لے کر جہاد کے لیے روانہ ہوجاتا۔

جامع ایوبؓ میں نمازیوں اور زائرین کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں استنبول کی روح اس مسجد میں کھنچ آتی ہے۔ قرّاء کی جماعتیں باری باری تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتی ہیں ترکوں کو قرآن پڑھنے اور قرآن سننے کا بڑا شوق ہے۔ نمازوں کے اوقات کے علاوہ بھی لوگ صرف قرآن سننے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ اور ہمہ تن گوش ہوکر کلامِ خداوندی کو سنتے ہیں۔ عورتوں کا بھی بڑا رجوع ہے۔ مغربی لباس میں ملبوس عورتیں جب مسجد میں داخل ہوتی ہیں تو ٹانگوں کو لمبے گون یا سیاہ جرابوں سے ڈھانک لیتی ہیں اور سروں پر رومال باندھ لیتی ہیں۔ پورا ماحول خشیت اور تقدس کی فضا سے معمور ہوتا ہے۔ مزارِ ایوبؓ کی طرح جامع ایوبؓ بھی تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ گنبدوں کے جھرمٹ اور پچی کاری کے کمالات دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں۔ بے اختیار اُس ترکی معمار کے حق میں کلماتِ تحسین زبان پر جاری ہوجاتے ہیں جس کے فن نے محمد الفاتح کی اس مخلصانہ کوشش کو چار چاند لگا دیئے۔ مسجد کے ایک مختلف کمرے میں آٹھ سو سال [illegible] جن پر [illegible] لگے ہوئے ہیں۔ اس ذخیرے نقدس کی وجہ سے

پرہیزگار ترک اس مسجد میں حضرت کے مزار کے پاس آتے ہیں۔ اور یہیں دلوں کی ایک حسین چیز رہتے ہیں۔

مزار ابو ایوبؓ: جامع ایوب میں دوگانہ ادا کرکے ہم مزار شریف کی جانب سلام کے لیے گئے۔ مزار کا وسیع و عریض صحن زائرین کے لیے ناکافی ہو رہا تھا۔ قبر مبارک ایک ہال نما کمرے کے اندر ہے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور دوسرے سے نکلتے ہیں۔ سلام کہنے والے مردوں اور عورتوں کی دو لمبی قطاریں لگ رہی تھیں۔ ۲۰۔۲۵ کی تعداد میں زائرین اندر داخل ہوتے اور سلام اور مختصر سی دعا کے بعد پہرہ دار سپاہیوں کے معمولی اشارے سے واپس ہو جاتے۔ پاکستانی زائر ہونے کی وجہ سے مجھے قطار کی پابندی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اندر داخل ہوا اور اس جلیل القدر صحابی کو، جو آج ترکی کی ملت مسلمہ کے دینی جوش و جذبہ کا محرک بنا ہوا ہے، سلام مسنون پیش کیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قبر خوش عقیدہ لوگوں کے تصرفات سے محفوظ ہے۔ کوئی نذر نیاز نہیں، گل پاشی و شمع افروزی نہیں، طواف و سجود نہیں۔ پر وقار سکوت چھا رہا ہے۔ لوگ پورے احترام اور وقار کے ساتھ دم سادھے سلام کرتے ہیں اور چند لمحات کے بعد نکل جاتے ہیں۔ ترک قوم کے اندر مجموعی طور پر جو نفاست اور سلیقہ شعاری پائی جاتی ہے وہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ساتھیوں نے بتایا کہ حضرت ابو ایوبؓ کا جسم مبارک سونے کے ایک جڑاؤ صندوق کے اندر ہے جو قبر کے اندر رکھا ہوا ہے۔ قبر کی ساخت ترکی طریقے کے مطابق سر کی جانب سے اونچی اور پاؤں کی جانب سے کافی پست ہے۔ ترکانِ جنگ آزما کا یہ قدیم عقیدہ ہے کہ زندگی کی طرح موت بھی نشیب و فراز سے بھری ہونی چاہیے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کا وہ مکان جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرتِ مدینہ کے وقت پہلی مرتبہ اترے تھے اُسے بارہا مدینہ منورہ میں دیکھا ہے۔ یہ مکان آنحضورؐ کے روضۂ اقدس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اور آج بھی اسی بزرگ خانوادہ کے ایک فرد ابوالجود انصاری کے پاس ہے۔ اب خود حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی زیارت بھی نصیب ہو گئی۔ وللہ الحمد۔

ایا صوفیا: استنبول کی بعض دوسری مسجدوں کی بھی طائرانہ زیارت کی۔ مگر خاکسار کے دل میں ایک نہایت قدیم آرزو چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ تھی جامع ایا صوفیا کی زیارت۔ یہ تاریخی جامع جسے اب ترکی کی سرکاری زبان میں ایا صوفیا میوزیم کہا جاتا ہے، اور ترکی کے مسلمان جامع ایا صوفیا کہتے ہیں، استنبول کے یورپی حصہ کے اندر منطقہ فاتح میں واقع ہے۔ نمازِ عصر سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہم جامع ایا صوفیا میں داخل ہو گئے۔ چونکہ یہ جامع

اب سرکاری طور پر میوزیم میں تبدیل ہو چکی ہے اس لیے اس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے اور اُن آداب و حدود کی پابندی نہیں کرائی جاتی جو مسجد کے لیے مخصوص ہیں۔ ایاصوفیا کیا ہے؟ انسان کی قوتِ تخلیق کا ایسا نگارخانہ جس میں حسن و جمال بھی نقطۂ کمال کو چھو رہا ہے اور تقدس و روحانیت کا سیلِ نور بھی موجزن ہے۔ چار میناروں کی مسجد آٹھ بھاری ستونوں پر قائم ہے۔ درمیان میں کانسی کی دیوہیکل قندیلیں آویزاں ہیں۔ پورا صحن اور دیواریں قیمتی پتھروں سے مرصع ہیں۔ یہ پتھر مصر سے منگوائے گئے تھے۔ اندر نماز کی جگہ پر ابھی تک قالین بچھے ہوتے ہیں۔ محراب میں امام کا مخصوص یونیفارم (سیاہ گون اور لال ٹوپی) رکھا ہوا ہے۔ صفوں میں ترکی مسجدوں کے رواج کے مطابق صد دانہ تسبیحیں بکھری پڑی ہیں۔ گویا خدا کے پرستاروں کی کوئی جماعت ابھی ابھی عبادت سے فارغ ہو کر اٹھی ہے۔ در و دیوار پر قرآن کی آیات، اسمائے حسنیٰ اور خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی کندہ ہیں۔ بیرونی صحن میں وضو کرنے کی ٹنکی نصب ہے جو گول دائرے کی شکل میں ہے اور چاروں طرف وضو کے لیے نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ عثمانی خلفاء کو مذہبی عمارات اور بالخصوص مساجد کی تعمیر سے جو دلچسپی تھی اُس کا صحیح عکس حرمِ مکی اور حرمِ نبوی کے بعد ایاصوفیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تاریخی پس منظر ایاصوفیا کی تعمیر ۲۳۶ء میں قیصر قسطنطین کے عہد میں ہوئی تھی۔ اس کے افتتاح پر قسطنطین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ایاصوفیا عظمت میں ہیکلِ سلیمانی پر فوقیت رکھتا ہے۔ قسطنطین کے ان الفاظ کا مدعا یہ تھا کہ یہودیت کے مقابلے میں عیسائیت برحق ہے۔ قسطنطین نے ایاصوفیا کو بظاہر آرتھوڈکس کلیسا کا نام دیا مگر یہ درحقیقت صلیبی حکومت کے سربراہ کا مرکز تھا اور اسے نہ صرف مذہبی حیثیت تھی بلکہ سیاسی اہمیت بھی حاصل تھی۔ سلطان محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو قیصر نے ایاصوفیا کو مرکز بنا کر سلطان کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان نے ایاصوفیا کی اسی سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر اسے کسی دوسرے تصرف میں لانے کے بجائے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ قسطنطنیہ میں محمد فاتح کا داخلہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ہوا تھا۔ یہ جمعہ کا روز تھا۔ ظہر کے قریب سلطان اپنے وزراء اور امراء کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ ایاصوفیا کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اُترا اور اس عالیشان معبد کے اندر چلا گیا جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی۔ سلطان نے مؤذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز دے۔ اور

حسب معمول نماز خطبہ جمعہ دینے کے بجائے اپنے شیخ الاسلام کو خطبہ دینے اور امامت کرنے کا حکم دیا۔ شیخ الاسلام نے حمد و ثنا کے بعد فتح قسطنطنیہ سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پڑھی کہ:۔ لتفتحن القسطنطينية فنعم الامير اميرها ولنعم الجيش جيشها۔ شیخ الاسلام نے فتح کی بے پایاں خوشی کے باوجود صحابہؓ کے احترام کے پیش نظر اس حدیث کی وضاحت میں کہا کہ فتح قسطنطنیہ کی ابتداء اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اس کا اصل سہرا اُن بزرگ ہستیوں کے سر ہے۔ عثمانی مجاہدین اس فتح کی محض تکمیل کرنے والے ہیں۔ سلطان محمد الفاتح اور آپ کے ساتھیوں نے دنیا پرست فاتحین کے برعکس قسطنطنیہ پر اپنے اقتدار کا آغاز خدا کے حضور سرافگندگی سے کیا۔ سلطان نے اعلان کر دیا کہ ایاصوفیا میں آج سے تین خداؤں کے بجائے صرف ایک خدا کا نام بلند ہوا کرے گا۔ ایاصوفیا کے صدر دروازے کی پیشانی پر سلطان نے مذکورہ بالا حدیث بھی ایک پتھر پر نقش کروا دی۔ یہ حدیث آج بھی ہر زائر کی نگاہ اولین کا مرکز بنتی ہے۔

ایاصوفیا اور ترک مسلمان | مصطفیٰ کمال پاشا کے عہد میں ایاصوفیا کی اسلامی حیثیت کو ختم کر دیا گیا اور اسے مسجد کے بجائے میوزیم قرار دے دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس ناروا اقدام پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا مگر لادینیت اور مغربیت انگیزی کی جو شمشیر اندھادھند اسلام کی ہر روایت کو کاٹتی چلی جا رہی تھی اس نے یہاں بھی ملت اسلامی کے جذبات کی کوئی پروا نہ کی۔ اب جب کہ ترکی میں اسلام نو کروٹ لے رہا ہے ایاصوفیا کو واگذار کرانے اور اسے بحیثیت جامع بحال کرنے کا مطالبہ بھی شدت پکڑتا جا رہا ہے۔ میرے ساتھی نائف آفندی، پروفیسر عزیر اور عبدالغفار سیزگین مجھے ایاصوفیا کے بارے میں برابر مستند معلومات فراہم کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ پاپائے روم نے کیتھولک چرچ اور آرتھوڈکس چرچ میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ترکی کا دورہ کیا اور اس دورہ میں اس نے نہ صرف ایاصوفیا کی زیارت کی بلکہ کیتھولک عقیدے کے مطابق باقاعدہ مذہبی مراسم بھی ادا کیے۔ ترکی کے اخبارات میں جب یہ خبر چھپی تو مسلمانوں پر گویا بجلی گر پڑی۔ مسلمانوں کے بارے میں ترکی حکومت کا رویہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص جذبۂ دینی سے مجبور ہو کر ایاصوفیا میں نماز پڑھ لیتا تھا تو پولیس اُسے زدوکوب کرتی

اور اس کے خلاف مقدمہ دائر کرنی تھی۔ مگر اب مسیحی سر براہ کو آزادانہ طور پر یہاں مذہبی مراسم ادا کرنے دیے گئے۔ اُن کے اندر بھی شدید ردِ عمل ہوا۔ چنانچہ استنبول یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی طرف سے یونین کے ممبروں کے نام یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ ایا صوفیا میں نماز پڑھنے کے لیے فوراً جمع ہوں۔ طلبہ کے اس فیصلے کو سن کر نہ صرف سینکڑوں طلبہ بلکہ استنبول کے ہزاروں نوجوان ایا صوفیا پہنچ گئے اور نماز باجماعت ادا کی۔ شہر میں خاصی ہلچل مچ گئی۔ حکومت نے طلبہ کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ نائف آفندی نے بتایا کہ وہ بھی ان گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ نائف آفندی نے بتایا کہ طلبہ کے لیڈروں نے حکومت کے گوش گزار کر دیا تھا کہ اگر ایا صوفیا کے اندر صلیب پرست اپنے مذہبی مراسم ادا کریں گے تو مسلمان بھی لازماً وہاں نماز ادا کریں گے۔

نائف صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پچھلے چار سالوں سے ایا صوفیا کا مسئلہ انتہائی نزاکت اختیار کر چکا ہے، اور اب سرکاری کمیٹیاں اس بات کا جائزہ لے رہی ہیں کہ کیا ایا صوفیا کو مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ عبد القادر سیزگین نے ایک وزیر رفعت سیزگین کے بارے میں بتایا کہ اُس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ "میں ترکی کے ایک شہری کی حیثیت سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بہتر یہ ہے کہ ایا صوفیا کو فی الفور مسجد کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے"۔ دوستوں نے بتایا کہ ایا صوفیا کے بارے میں ترک مسلمانوں کے دل انتہائی زخم خوردہ ہیں جس محفل میں ایا صوفیا کا ذکر آجاتا ہے لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور سینوں میں آتشِ غم کے شعلے فروزاں ہو جاتے ہیں۔ عبد القادر سیزگین نے مجھے ایا صوفیا سے متعلق ترکی نظم کے چند اشعار بھی سُنائے جو آج کل زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ یہ نظم ترکی کے موجودہ نامور شاعر عثمان یوکسل کی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب فتح استنبول کی پانصد سالہ سالگرہ منائی گئی تھی تو یہ نظم اُس وقت ترکی کے اخبارات میں چھپی تھی اور اس سے ایک دھوم مچ گئی تھی۔ جس روز یہ نظم اخبارات میں چھپی اُسی روز عثمان یوکسل گرفتار کر لیے گئے[1]۔ نائف آفندی نے مجھے یہ پوری نظم قلمبند کرا دی۔ پاکستان کے دوستوں کے لیے میں اس نظم کا اُردو ترجمہ پیش کرتا ہوں:-

---

[1] عثمان یوکسل پر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ دائر ہوا۔ اور طویل بحثوں کے بعد عدالت نے موصوف کو بری کر دیا۔

اَے ایا صوفیا! اَے پرتوِ اسلام، اَے ... یہ اعجاز مسلم، اے معبدِ زیبا!

ایا صوفیا! تو تنہا کیوں ہے؟ تجھ پر یہ کیسا سکوت طاری ہے؟

تیرے میناروں کی بلندیوں سے اب کیوں تکبیر کی آواز سنائی نہیں دیتی کیوں اب تیری طرف سے صدائے فلاح بلند نہیں ہوتی۔ وہ تیرا عہدِ پر شکوہ تیری جلوہ آرائی اور نور افگنی کدھر گئی؟

ایا صوفیا! تو میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتی؟ اے ایا صوفیا، اے یگانہ و تنہا، ایا صوفیا! اب تیرے منبرِ دُربار سے صدائے حق کیوں نہیں اُٹھتی؟ تیرے محراب کے دامن میں اب جبینیں کیوں خدا کے حضور سجدہ ریز نہیں ہوتیں۔

ایا صوفیا! کل تیری خاک نے ایمان سے لبریز مجاہدوں کے اشک خود اپنی آنکھ سے بہتے دیکھے تھے۔ اور آج تیرے فرشِ پاک کو کیسے لوگ پامال کر رہے ہیں۔

آہ اے ایا صوفیا! تیرے حق میں اِس ظلم کا ارتکاب کس نے کیا ہے؟ اور کس نے بظاہر تجھ سے تیرا نور چھیننے کی جسارت کی ہے؟

تیری قرآن کی نوائے دلنشین جو دلوں کو لرزا دیتی تھی اب کہاں ہے؟

ایا صوفیا! تیرا چراغ کس نے گل کرنے کی حماقت کی؟ وہ کون نادان تھا جس نے قرآن کو معبدِ فاتح سے باہر نکال دیا اور تجھے کارگر ہتھیار سے محروم کر دیا؟

ایا صوفیا! برملا کہہ دے کہ ایک تباہ کار ہاتھ نے تیرے دل پر زخم کاری لگایا ہے۔ برملا کہہ دے کہ ایک پاگل شخص نے ایا صوفیا کو دوبارہ بتکدہ بنا دیا ہے۔

لیکن اے ایا صوفیا! اے معبدِ زیبا! ہم تجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے، ہم بزرگ فاتح کے سپوت ہیں ہم عنقریب بتوں کو پاش پاش کر دیں گے اور تجھے دوبارہ مسجد پر شکوہ میں تبدیل کر دیں گے۔

اس وقت ہم ... [illegible] ... کے ساتھ مل کر ... [illegible] ... تیار رہے

اشکوں سے وضو کریں گے اور تجھے سجدوں سے بھر دیں گے اور تیرے چپے چپے
پر یکتا خالق کی بندگی بجا لائیں گے۔
وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ تیرے خاموش گوشوں سے اللہ اکبر کی صدائے
دل آویز بلند ہو گی اور اہلِ جہاں کے کانوں سے ٹکرائے گی۔
تب تمام دنیا یہ سمجھ جائے گی کہ محمد الفاتح از سرِ نو زندہ ہو گیا ہے۔

ترکوں کے دل کی دھڑکن | ایا صوفیا میں داخل ہو کر انسان عجیب کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ ایا صوفیا کی زیارت کسی تاریخی اثر یا میوزیم یا فنِ تعمیر کا قائل و دیدمونہ ہونے کی بنا پر نہیں کروں گا بلکہ مسجدِ اسلام کی حیثیت سے کروں گا۔ چنانچہ ایا صوفیا میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ محراب کے پاس دوگانہ ادا کیا اور قبل اس کے کہ پولیس کے محافظ دستے کو اطلاع ہوتی دوگانہ سے فارغ ہو گیا۔ ایا صوفیا کا اندرونی ہال سیاحوں اور زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ میرے نماز ادا کرنے پر یہ لوگ برابر مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے رہے اور جب تک میں مسجد کے اندر رہا چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ نائف آفندی نے بتایا کہ ترکی کے بکثرت نوجوان مہم کے طور پر یہاں آکر نماز پڑھتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نوجوان نماز پڑھ رہا ہوتا ہے اور اس کی پشت پر پولیس کا سپاہی بید زنی کر رہا ہوتا ہے۔ مجھے استنبول، انقرہ اور قونیہ میں کئی ایسے نوجوان ملے جنہوں نے مجھے فخر سے بتایا کہ وہ ایا صوفیا میں بحالتِ نماز پولیس کے بید کھانے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور متعدد اس جرم میں ۳ ماہ اور ۶ ماہ کی قید بھی بھگت چکے ہیں۔ مگر اب یہ معاملہ منتظمین کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ افراد کے بجائے اب نوجوانوں کے گروہ ایا صوفیا میں نماز کے لیے جاتے ہیں اور اس بارے میں پولیس کے تشدد اور قانون شکنی کی پروا نہیں کرتے۔ حال ہی کی بات ہے کہ استنبول یونیورسٹی کے ۰۰ طلبہ ایا صوفیا میں گھس گئے اور نماز باجماعت ادا کی۔[1] میرا اندازہ ہے کہ ایا صوفیا ترکی میں اسلامی انقلاب کا نقطۂ انفجار ثابت ہو گی کیونکہ یہ مسجد ترک نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن چکی ہے۔

ایا صوفیا کا ماضی، دور اس کا حال اور ترکی مسلمانوں کا اس سے لگاؤ اور اس کی روح پرور فضا اور تعمیری حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ گھنٹہ یا دو گھنٹے اس کے لیے ناکافی ہیں۔ ایا صوفیا سے

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ اتحاد، استنبول ۲۹ اپریل ۱۹۶۶ء ۵۶

باہر نکلا تو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور دل جذبات سے بہہ رہا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ ایا صوفیا کو سلامِ رخصت پیش کیا کہ جب دوبارہ استنبول میں حاضری ہوگی تو ان شاء اللہ تیرے میناروں سے نعرۂ توحید بلند ہو رہا ہوگا، خوش نوا قرّاء تیرے گوشوں میں بیٹھے نغمۂ سرمدی الاپ رہے ہوں گے اور ترکانِ باصفا کی جماعتیں تیرے دامن میں بحضورِ خدا جبہہ سائی کر رہی ہوں گی۔

مسجد نیلگوں نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ایا صوفیا کے سامنے کی سڑک کے اُس پار مسجد سلطان احمد ہے۔ جسے مسجد نیلگوں بھی کہا جاتا ہے۔ نماز کے لیے ہم اس مسجد میں چلے گئے۔ یہاں بھی نمازیوں کا جمِ غفیر تھا۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ قرّاء نوبت بہ نوبت قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ حاضرین کپڑے کی ٹوپیاں اوڑھے سربجیب قرآن سننے میں محو تھے۔ ہیٹ ترکی کے قومی لباس کا ایک جزء ہے۔ مگر مسلمان جب مسجد میں آئے گا تو ہیٹ دروازے پر موجود محافظ کے حوالے کر دے گا اور اپنے نمبر کا ٹوکن لے لے گا۔ استنبول کی جو چیزیں زیارت کے قابل ہیں۔ اُن میں یہ مسجد نیلگوں بھی ہے۔ یہ دنیا میں وہ واحد مسجد ہے جس کے چھ مینار ہیں جو اس قدر کم چوڑے ہیں کہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کی کسی مسجد میں اتنی طوالت کے ساتھ اس قدر کم چوڑائی کے مینار نہیں ہیں۔ اسے سلطان احمد اوّل نے ۱۶۰۹ء تا ۱۶۱۶ء میں سات سالوں کے اندر تعمیر کروایا تھا۔ تعمیر کے دوران عجلت میں یہ حقیقت فراموش ہوگئی کہ چھ میناروں کا امتیاز روزِ اوّل سے مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام کے لیے مخصوص ہے۔ مگر اب مسجد تیار ہو چکی تھی اور اس میں تبدیلی کا وقت نہیں رہا تھا اس لیے سلطان احمد نے اپنی مسجد کے مینار منہدم کرانے کے بجائے مسجد الحرام میں ایک مینارہ کا اضافہ کروا دیا اور اس کے سات مینار ہو گئے۔ اگر کسی مسجد کے مینار مسجد الحرام کے میناروں سے زیادہ ہوں تو شرعاً اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر عثمانی خلفاء جو حرمین شریفین کے سچے خادم تھے اور جن کے دل اسلام کی محبت سے منوّر تھے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ سلطان احمد کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی مسجد کسی لحاظ سے مسجد الحرام پر فوقیت حاصل کرے۔ مسجد کا پورا فرش مرمر کی بڑی بڑی سلوں کا بنا ہوا ہے۔ گرینائٹ کے ۲۶ ستونوں نے گنبدوں کے سلسلۂ طویل کو اٹھا رکھا ہے۔ بڑا گنبد درمیان میں ہے۔ زائر جب مسجد کی دہلیز عبور

کر کے اندر قدم رکھتا ہے تو وہ ایک حیرت انگیز منظر میں ڈوب جاتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے گنبدوں کی رَو اُس کے ساتھ ساتھ محوِ خرام ہے جو آخر کار درمیان کے بڑے گنبد میں جا کر گر جاتی ہے۔ عمارت کی خوبصورتی کو ہم عربی زبان میں یوں ادا کریں گے کہ آیۃ فی فن العمارۃ وفن الزخرفۃ۔ یہ عمارت جس معمار کا کرشمہ ہے اُس کا نام محمد آغا تھا۔ چونکہ مسجد کی دیواریں نیلے اور سبز نقوش سے مزین ہیں اس لیے اُسے مسجد نیلگوں کہا جاتا ہے۔ مسجد کے اندر حجرِ اسود کا ایک ٹکڑا بھی موجود ہے۔

ترکوں کی اصل طلب! نمازِ عصر کے بعد نمازیوں کا جمِ غفیر میری طرف لپکا۔ کوئی میرے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور کوئی میرے لباس کو مَس کرتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں ترک نمازیوں کی نگاہ میں کوئی پیرِ مغاں تھا۔ بلکہ صرف اس وجہ سے کہ میں مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ عبدالقادر سیز گین نے لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ میں "پاکستان کے بڑے عالمِ دین، اور اسلامی مفکر اور خدا رسیدہ بزرگ کا شاگرد ہوں" تو پھر کیا تھا حاضرین کی عقیدت دوچند ہوگئی اور لگے ہاتھوں مجھے تقریر کی دعوت پیش کر دی گئی۔ حاضرین میں یونیورسٹی کے طلبہ اور بعض پروفیسر بھی تھے اور اکثریت تاجروں کی تھی۔ میں نے اُن لوگوں کے اصرار پر قرآن کریم کا ایک رکوع تلاوت کیا اور اُس کے بعض حصوں کی تشریح کر دی۔ اور یوں "جوابِ عقیدت" کے بارے سبکدوش ہُوا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ دل ترکی کی سیاحت کو جائے تو اُسے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ کہ اُسے کسی بھی وقت تقریر کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ کم از کم ترک اس سے قرآن کریم کا کچھ حصہ یا کوئی عربی یا فارسی نعت یا مسنون دعائیں اور مناجاتیں سنے بغیر معاف نہیں کریں گے۔ اور اگر انہیں یہ محسوس ہو گیا کہ زائر کو مذہب سے دلچسپی نہیں ہے تو اُن کی دلچسپی بھی زائر سے کم ہو جائے گی۔ ترکی میں سیاحوں کی کمی نہیں ہے۔ دنیا بھر کے سیاحوں سے ترکوں کا پالا پڑتا ہے[1]۔ وہ سیاحوں کو ذریعۂ آمدنی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بے شک وہ سیاح کی بھرپور خدمت کرتے ہیں مگر مادی احساسات کے تحت۔ لیکن ترکوں کے دل میں وہی اُتر سکتا ہے جو اُن کے پاس اسلام کی سوغات لے کر جائے۔

---

[1] ترکی میں تقریباً ۷½ لاکھ سیاح سالانہ آتے ہیں۔ ان میں سے ۳ لاکھ کے قریب وہ سیاح ہیں جو صرف یورپ سے آتے ہیں۔

روزنامہ بگُن استنبول کے جن لوگوں سے مجھے ملنے کا بے حد شوق تھا اُن میں سے بُگُن اخبار کے ایڈیٹر اور مالک محمد شوکت ایجی بھی تھے۔ روزنامہ بُگُن جس کا اردو ترجمہ امروز ہے، پچھلے سال معرض وجود میں آیا ہے۔ مگر اس کی تند و تیز تحریروں اور حیرت انگیز انکشافات اور بے لاگ تنقیدوں نے پورے ترکی میں ہلچل مچا رکھی ہے۔ سعودی عرب اور لبنان کے اخبارات میں بُگُن کی تحریروں کے عربی تراجم نظروں سے گزرتے رہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ترکی کے اسلامی محاذ میں ایک نڈر مجاہد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ رابطۂ عالم اسلامی کے مرکزی دفتر (مکۂ مکرمہ) کے ایک دوست نے بڑی تاکید کی تھی اور تعارفی خط بھی دے دیا تھا کہ میں محمد شوکت صاحب سے استنبول میں ضرور ملوں۔ چنانچہ میں نے نائلف آفندی سے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور طے پایا کہ مغرب کے بعد بُگُن اخبار کے دفتر میں جائیں گے۔ افطاری آج بھی مدرسۂ امام و خطیب میں تھی۔ افطاری سے پہلے کا وقفہ گزارنے کے لیے دوست مجھے ترک طلبہ کی فیڈریشن کے دفتر میں لے گئے۔ میرے لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ کس شارع اور کس سمت یہ دفتر واقع ہے۔ یوسف صاحب کی موٹر ادھر سے اُدھر لیے لیے پھرتی رہی اور میں موٹر کے اندر بیٹھا کبھی استنبول کے خوبصورت مگر تعلیق، مغربی لباس میں ملبوس مگر جذبہ ایمانی سے بھرپور لوگوں کے چہروں پر بھر کنی نظریں ڈالتا، کبھی استنبول کی قدیم و جدید عمارتوں کے منظر سے اپنی بے تاب نگاہوں کی خدمت کرتا، کبھی ساتھیوں سے پوچھتا کہ سلاطین کا قدیم قصر توپ کاپی کہاں ہے، اسلامی میوزیم کہاں ہے۔ دولما باغچہ کا قصر کہاں ہے، بابِ عالی کہاں ہے، اور وہ چار جزیرے کدھر واقع ہیں جو شہزادوں کے جزیرے کہلاتے ہیں جن کا قدرتی حسن بلا کا فتنہ خیز بتایا جاتا ہے۔ اور کبھی ان سطحی باتوں سے ہٹ کر اسلامی آثار اور اسلامی کتب خانوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا۔ کیفیت یہ تھی کہ ؎

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

ترک طلبہ کی تنظیمیں باتوں باتوں میں ہم ترک طلبہ کے وفاق ملّی کے مرکز میں پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑی وسیع عمارت ہے جس کی دوسری منزل پر بہت کشادہ ہال ہے اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ جن میں دفاتر ہیں۔ نچلے حصے میں سیاحوں کی معلومات اور رہنمائی کا دفتر ہے جس میں طلبہ ہی رضاکارانہ

خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ غیر ملکی زائرین کے لیے طلبہ کی یہ خدمت بڑی قابلِ قدر بلکہ قابلِ رشک ہے۔ دل میں بار بار یہ خواہش اٹھتی رہی کہ کاش اپنے ہاں بھی طلبہ کی تنظیمیں اس پہلو پر توجہ دیں۔ مرکز کی اس وقت مرمت اور صفائی ہو رہی تھی اس لیے بعض دفاتر بند تھے۔ وفاق ملی کے نائب صدر جناب حسین جوجکن سے ملاقات ہوگئی۔ وفاق کے جنرل سیکرٹری بھی آگئے۔ وقت اگرچہ کم تھا مگر دونوں بڑے تپاک سے ملے اور مولانا محترم کی صحت و عافیت دریافت کرنے لگے۔ وفاق کے نائب صدر اور جنرل سیکرٹری دونوں اسلام پسند ہیں۔ اگرچہ وفاق میں مختلف الخیال عناصر پائے جاتے ہیں مگر اسلام پسندوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وفاق کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ نکلتا ہے جس میں اسلامی مفکرین کے مضامین بھی چھپتے ہیں۔ حسین جوجکن مسکرا کر کہنے لگے کہ حضرت مودودیؒ ترکی آرہے ہیں۔ ہم اُن کی آمد سے پہلے ہال کی صفائی کروا رہے ہیں۔ ان کی سب سے پہلی تقریر اسی ہال میں ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ حضرت کے شایانِ شان ہال کی سج دھج ہو اور ہماری قدیم آرزو طمطراق سے بروئے کار آئے۔ میں یہ سن کر دل میں سوچنے لگا کہ استنبول تو اپنی جگہ مولانا محترم کے استقبال کے لیے زور و شور سے تیاریاں کر رہا ہے مگر سوال یہ ہے کہ مولانا محترم اس حالت میں کیسے یہ بار اٹھا سکیں گے۔ حسین جوجکن جس خوشی میں مگن تھے میں نے یہ بتا کر اُسے مکدر کرنے کی کوشش نہیں کی کہ مولانا محترم کا ترکی ٹھہرنا یقینی نہیں ہے۔ حسین جوجکن نے بتایا کہ استنبول کے ہوائی اڈے پر مولانا محترم سے ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔ مگر ۴۰ منٹ کی اس ملاقات نے آتشِ شوق کو تیز تر کر دیا ہے۔ میں نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے حسین سے پوچھا کہ طلبہ میں اسلامی رجحانات کے فروغ کا کیا حال ہے؟ بتانے لگے کہ اسلامی رجحان برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اور طلبہ صاف طور پر دو گروہوں میں بٹتے جا رہے ہیں۔ ایک اسلام پسند اور دوسرا قوم پرست۔ مؤخر الذکر گروہ میں آزاد خیال، سوشلسٹ اور مغرب پرست تمام عناصر شامل ہیں اسلام پسندوں کا محاذ بڑے سنجیدہ، دلیر اور مخلص کارکنوں پر مشتمل ہے۔ دونوں کا مقابلہ زبردست ہے۔ اور دونوں مختلف انداز سے پنجہ آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ حسین جوجکن بڑے اعتماد اور جگرداری کے ساتھ کہنے لگے کہ "مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

ترک طلبہ کی ایک اور تنظیم کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس تنظیم کا نام ہے اسلامک انسٹی ٹیوٹ فیڈریشن آف ترک طلبہ۔ یہ بڑی جاندار تنظیم ہے۔ اس کی طرف سے "اسلام مدنیت" (تمدن اسلام) کے نام سے ایک ماہانہ میگزین بھی استنبول سے نکلتا ہے جس میں ترک اہلِ قلم کے علاوہ مولانا مودودی، مولانا ابوالحسن ندوی، شیخ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر حمید اللہ اور اخوانی رہنماؤں کے مضامین بھی چھپتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں اسلامک انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں اس تنظیم کی شاخیں موجود ہیں۔ یہ تنظیم اسلام کے احیاء کے لیے بڑی موثر کوششیں سرانجام دے رہی ہے۔ "اسلام مدنیت" میگزین جس معیار کا پرچہ ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا ستمبر ۱۹۶۸ء کا شمارہ فتح استنبول نمبر تھا اور محمد الفاتح کے ہاتھوں استنبول کی فتح کو ۵۱۵ سال گزرنے پر نکالا گیا تھا۔ اس طرح نزول قرآن کی چودہ صد سالہ تقریب پر بھی اس نے خصوصی نمبر نکالا تھا۔ مولانا مودودی جب لندن جاتے وقت استنبول کے ہوائی اڈہ پر ٹھہرے تھے تو اس تنظیم کے کارکنوں کا ایک وفد مولانا محترم سے ملا اور اس نے اپنی تنظیم کی طرف سے اپنے میگزین کا ایک سیٹ ترکی جھنڈے میں لپیٹ کر اس ٹائیٹل کے ساتھ مولانا محترم کی خدمت میں پیش کیا کہ BUYUK ISLAM MUCAHIDINE (اسلام کے مجاہد اعظم کی خدمت میں نذرانہ عقیدت)۔ میں نے اپنے ترک دوست صالح اوزجان سے دریافت کیا کہ ترکی جھنڈے کے اندر میگزین کو لپیٹ کر پیش کرنے میں کیا حکمت تھی؟ صالح اوزجان نے بتایا کہ "ترکی کا پرچم سرخ جس کے وسط میں سفید رنگ کا ستارہ و ہلال ہے اب سیکولرزم کا شعار نہیں اسلام کا شعار بنے گا"۔ طلبہ کی مذکورہ بالا دونوں تنظیمیں عربوں کی حمایت اور یہودیوں کی جارحیت کے خلاف آواز بلند کرتی رہتی ہیں۔ میرے رفیق نائف آفندی نے بتایا کہ اس سال میں جون کے پہلے ہفتے میں یوم فلسطین منایا گیا ہے۔ اور ایک عظیم اجتماع منعقد کیا جا چکا ہے جس میں ۴ ہزار طلبہ شریک ہوئے تھے۔ مرکز کے بیرونی دروازے کی پیشانی پر ایک بینر لٹکایا گیا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "فلسطین میں یہودیوں کے مظالم"۔ ایسے ہی ۲۵ بینر استنبول کی مختلف سڑکوں پر لٹکائے گئے تھے۔ اجتماع کمیٹی کی طرف سے مسئلہ فلسطین کے موضوع پر شہر میں وسیع پیمانے پر لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ ہال کے اندر نمائش لگائی گئی جس میں فلسطینی مہاجرین اور ناپام بموں سے متاثر ہونے والوں کی تصاویر پیش کی گئیں۔ مختلف طریقوں سے یہ دکھایا گیا کہ یہودیوں کے آئندہ عزائم کیا ہیں۔ اسٹیج پر مسجد اقصیٰ کی بہت بڑی تصویر نصب تھی۔ مختلف مقررین نے تقریریں کیں۔ ترکی شعراء نے نظمیں سنائیں جنہیں سن کر

لوگ رو رہے تھے۔ الغرض طلبہ نے مسلمانوں کے اس اہم مسئلہ پر ترک ملت کو متوجہ کرنے کی پوری کوشش کی یہ ہے اُن مسلمان ترکوں کا رویہ جنہیں عرب برابر مطعون کرتے چلے آ رہے ہیں۔

بقیہ اشارات

سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ مذہبی اجارہ داریوں کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے تو صنعتی اور تجارتی اجارہ داریوں کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ وہ مذہبی روایات کے بندھن توڑتی ہے تو اجتماعیت کی جکڑ بندیوں میں جکڑی جاتی ہے۔ وہ عدل و انصاف کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو اپنی متاعِ آزادی کھو بیٹھتی ہے آپ انسان کی محرومی کے اسباب کا جس قدر تجزیہ کریں گے ایک ہی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کی بنیادی وجہ اجتماعی زندگی کی صورت گری کرنے والی طاقت پر شیطان کا قبضہ ہے۔ اگر قلب و دماغ کی تطہیر کے لیے خون کی طرح گردش کرنے والے اندر کے شیطان سے جنگ آزما ہونا ناگزیر ہے اور یہ ایمان کا بنیادی تقاضا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جو شیطان خارج میں انسان کی پوری زندگی پر قابض ہو کر اسے کفر و الحاد کی راہ پر لے جا رہا ہے اس کے خلاف صف آرا ہوا جائے۔

جماعت اسلامی کو کسی فرد یا کسی گروہ سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن یہ بات ہے کہ فرد بحیثیت فرد کے تو نیکی اور بھلائی کا طالب اور آرزومند ہو، اپنے خالق اور مالک کی غلامی کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہو، لیکن جب یہ سارے افراد اجتماعی زندگی کی تعمیر کرنے لگیں تو پھر خدا سے بغاوت کی راہ اختیار کریں۔ وہ قوت جو انہیں باطل کی اس راہ پر زبردستی دھکیل کر لے جاتی ہے اس قوت کے خلاف جدوجہد دین کے قیام کے لیے بے حد ضروری ہے اور یہی وہ کام ہے جو جماعت اسلامی کر رہی ہے اور دوسروں کو کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

طاغوت سے پنجہ آزمائی ہمارے نزدیک دنیا داری نہیں بلکہ عین ایمان ہے۔ ہم اس کی غیر معمولی قوت و

طاقت اور اس کے گہرے اثرات سے کبھی صرفِ نظر کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ ہم ایمانداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا میں خدا کی بندگی کی راہ میں یہی طاغوت حائل ہے اور اگر اسے اس راہ سے ہٹا دیا جائے تو انسان کی پوری زندگی نیکی، بھلائی، خدا ترسی سے معمور ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اس کام کو دنیا داری کے کام اور اس نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں کو دنیا پرستی کہہ کر ہدفِ تنقید بناتے ہیں انہیں اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کیا اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوشش کرنا دین سے انحراف ہے؟ کیا طاغوت کی گرفت کو کمزور کرنے کی فکر کرنا دین سے بغاوت ہے؟ اور کیا اسلامی نظام کے قیام کے لیے فضا سازگار بنانا دنیا پرستی ہے؟

بات ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض لوگ اجتماعی زندگی کے بارے میں جماعت اسلامی کے موقف کو دیکھ کر اس خدشہ کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ غالباً اب یہ جماعت مغرب کے اُن نظریات کا اثر قبول کر چکی ہے جن کے مطابق فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی تبدیلی صرف خارجی ماحول کے بدلنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ ہم اس نظریے کو یکسر باطل سمجھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ محض خارجی حالات کے بدل دینے سے اندر کے انسان کو نہیں بدلا جا سکتا۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک نیکی اور بھلائی کے احساسات انسان کے اندر سے نہ اُبھریں اس وقت تک خارجی تبدیلیاں قطعاً مؤثر ثابت نہیں ہوتیں۔ ہمارا موقف اجتماعیت پرستی کے نظریے سے بالکل مختلف ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر خیر اور بھلائی کے جو جذبات پیدا ہوں، انہیں لازمی طور پر اجتماعی زندگی میں بھی جلوہ گر ہونا چاہیے۔ اور جو قوتیں اس راہ میں حائل ہوں انہیں سرنگوں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم تبدیلی کے لیے وہی راستہ صحیح اور مؤثر سمجھتے ہیں جس کی قرآن مجید نے نشان دہی کی ہے کہ انسان کو اندر سے بھی بدلا جائے اور خارج میں وہ حالات بھی پیدا کیے جائیں جو صالح انسان تیار کرنے کے لیے درکار ہیں۔ اس بنا پر ہماری اجتماعی سرگرمیوں کو اجتماعیت کے باطل نظریے پر محمول کرنا سخت ناانصافی ہے۔ ہم اپنے کام کا آغاز انسان کی باطنی اصلاح سے کرتے ہیں۔ مگر ہم اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ باطنی اصلاح کے نشوونما کے لیے انسان کو سازگار ماحول میسر آئے اور جو قوتیں اس کام میں مزاحمت پیدا کریں انہیں راستہ سے ہٹا دیا جائے۔

مطبوعات

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ جاوید پیغام THE LIVING MESSAGE OF MUHAMMAD

تالیف: جناب صوفی محبوب الٰہی صاحب۔ شائع کردہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔کراچی۔ قیمت سات روپے، صفحات ۱۲۴۔

اس قابلِ قدر تصنیف کے مصنف پاکستان کے علمی اور دینی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ایک غیر مسلم گھرانے میں جنم لیا مگر ابھی تعلیم سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ باری تعالیٰ نے انہیں اسلام کی دولت سے نوازا۔ اس دولت کی انہوں نے بڑی قدر کی اور اللہ کے دین کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ یہ کتاب بھی اُن کے اسی نیک جذبے کی ترجمان ہے۔ اس میں انہوں نے الفاظ کے اختصار مگر معنوی جامعیت کے ساتھ حضور سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ، اُن کے مقدس پیغام کو قلمبند کیا ہے۔ اندازِ بیان سادہ اور مؤثر ہے۔ نو مسلموں کو اسلام سے متعارف کروانے اور نوجوانوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی اور آن کے پیغام سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے یہ ایک نہایت مفید کوشش ہے۔ معیارِ طباعت نہایت اچھا ہے مگر افسوس کہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

فون نمبر: ۶۲۵۰۷ — رجسٹرڈ ایل نمبر: ۳۵۴۰